(آپ بیتی)

میری دنیا

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلیکیشنز

بک سٹریٹ 39-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

e-mail: tarikh.publishers@gmail.com

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ ہیں

نام کتاب : میری دنیا (آپ بیتی)

مصنف : ڈاکٹر مبارک علی

اہتمام : ظہور احمد خاں

پبلشرز : **تاریخ پبلیکیشنز**

بک سٹریٹ 39-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

سرورق : نین تارا

اشاعت : 2012ء

قیمت : -/300 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39-مزنگ روڈ لاہور، فون: 37237430-37249218-042

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 2780608-022

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی

فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

نین تارا کے نام!

کوئے قاتل میں ہمیں بڑھ کے صدا دیتے ہیں
زندگی آج ترا قرض چکا دیتے ہیں

قابل اجمیری

فہرست

1- ابتدائیہ	9
2- بیقراری	17
3- میری دنیا	23
4- ملازمتیں	44
5- دوستی	60
6- میرا علمی سفر	86
7- میری تاریخ نویسی	106
8- تاریخ کے تاثرات	130
9- ہندوستان سے روابط	142
10- امریکہ کی دنیا	174
11- تلخ نوائی	185
12- تاثرات	190

ابتدائیہ

یہ میری یادداشتوں کی دوسری جلد ہے۔ میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان یادوں اور تاثرات کو لکھا جائے کہ جن سے قاری کو دلچسپی ہو۔ میں نے انہیں رنگین بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ میرے ذہنی سفر کی داستان ہے۔

یہ کتاب میں نے اپنی چھوٹی بیٹی نین تارا کی فرمائش پر لکھی ہے، اس کو اس پر سخت اعتراض تھا کہ میں نے اپنی پہلی یادداشت میں اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ اس لحاظ سے وہ اس کتاب یا یادداشتوں کے لکھنے کی وجہ بنی۔ میں خوش ہوں کہ اس نے مجھے یہ لکھنے پر مجبور کیا۔

میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میری شریک حیات ذکیہ اور مجھ میں ذہنی ہم آہنگی ہونے کی وجہ سے گھریلو پریشانیوں سے دور رہا اور اپنے علمی کاموں میں مصروف رہا۔ میری تحریروں میں وہ بھی برابر کی شریک ہیں۔

دوستوں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ جن کی محبت اور شفقت، زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ لاہور میں روز اسلم گورداسپوری سے فون پر بات ہوتی ہے اور علمی تبادلہ ہوتا ہے۔ ہفتہ کو جو دوست پابندی سے نیرنگ گیلری میں ملتے ہیں، ان میں رفاقت علی، قاضی جاوید، شہزاد، سلمان عابد، شہزاد بھٹی، لیاقت ہاشمی، غافر شہزاد، زمان خان، امجد علی اور کبھی کبھی آنے والے دوست ہیں، جو یہاں گفتگو میں شریک ہوتے ہیں۔

لاہور میں جن دوسرے دوستوں سے ملاقاتیں رہتی ہیں، ان میں ظفر علی خاں جو پڑھتے بہت ہیں، مگر لکھتے کم ہیں، ان سے بات کر کے ہمیشہ بہت سی نئی باتیں اور خیالات سے آگاہ ہوتا ہوں۔ پرویز وندل اور ساجدہ وندل، اگر چہ مصروف لوگوں میں سے ہیں مگر یہ اکثر کھانے پر بلا لیتے ہیں، ان کے ساتھ گفتگو کر کے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے، آج کل یہ

تھاپ ٹرسٹ کے ذریعہ لیکچرز بھی کراتے ہیں، اور سالانہ کانفرنس بھی۔ یہ بین الاقوامی کانفرنس اب شہرت اختیار کرگئی ہے۔

محمود مرزا صاحب ہمارے بزرگ دوست ہیں، جو ہمیشہ پاکستان کی بہبود میں غرق رہتے ہیں اور وہ منصوبے بناتے ہیں کہ جو اس ملک کو ترقی کے راستے پر کیسے چلاسکیں۔

ڈاکٹر روبینہ سہگل پاکستان کی ان چند اسکالرز میں سے ہیں کہ جن کی گرفت سماجی علوم پر ہے۔ان سے بات چیت کرکے ذہن کو ہمیشہ تازگی ملتی ہے۔

انور کمال ایڈووکیٹ کبھی بہت ملتے تھے، اب کبھی کبھی اچانک آ جاتے ہیں، اور وقت گزرنے کے باوجود ان میں ابھی تک وہی جوش وخروش ہے جو کبھی جوانی میں تھا۔ رضی عابدی، خوش مزاج اور ملنسار دوست ہیں۔ انگریزی کے جگت استاد ہیں ان سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر انیس عالم اگرچہ فزکس کے استاد ہیں مگر سماجی علوم پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔

ندیم عمر اب لاہور چھوڑ کر راولپنڈی کے این۔سی۔اے میں چلے گئے، ان سے اب فون پر رابطہ ہو جاتا ہے۔ وہ میرے ساتھ پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام تاریخ اور آج کی دنیا میں ساتھ رہے۔

طاہرہ مظہر علی، اب بیمار ہیں، مگر ذہنی طور پر چاق وچوبند، وہ ہر اتوار کو جب بھی میرا ڈان میں مضمون پڑھتی تھیں، فوراً فون کرتی تھیں۔ان کے ہاں وقت کی بڑی پابندی ہے، جب بھی وہ لنچ پر بلاتیں، وہ ساڑھے بارہ بجے ٹھیک شروع ہو جاتا تھا۔ ہر فنکشن میں وہ وقت پر پہنچتیں، چاہے ہال میں دو یا تین لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔ لاہور میں انہوں نے اور مظہر علی خاں نے ہمیشہ محبت اور شفقت کا سلوک کیا۔مظہر صاحب سے پہلی ملاقات 1985ء میں ہوئی تھی، جب میں اور عیسیٰ داؤد پوتہ لاہور آئے تھے۔ میرے لاہور میں منتقل ہونے کے بعد جب بھی مظہر صاحب سے ملا، وہ اسی محبت کے ساتھ ملتے رہے۔

نوجوان دوست ریحان افضال میں بڑی توانائی ہے۔ وہ سچائی کی تلاش میں ہیں، اور جب بھی ملتے ہیں سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ میں اکثر ان کے سوالوں سے پریشان ہو جاتا ہوں۔ چوہدری اظہر صاحب اگرچہ ایک بڑے بیوروکریٹ ہیں، مگر پڑھنے کی عادت ان

کو میرے قریب لے آئی۔ اب جب بھی سرکاری دفتروں میں کام ہوتا ہے تو ان کا حکم ہے کہ ان سے کہا جائے وہ اس میں مدد کرتے ہیں۔ یہ ان کی محبت ہے کہ وہ نہیں چاہتے کہ میں سرکاری دفتروں میں دھکے کھاتا پھروں۔ جب کبھی وہ احمد رضا صاحب کے ساتھ آتے ہیں تو دن اچھا گزرتا ہے۔ احمد رضا صاحب انگریزی، فارسی اور اردو زبانوں کے ماہر اور تاریخ کے مضمون سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس لئے ان کی شگفتہ گفتگو ہمیشہ مزہ دیتی ہے۔ افضل ملک اگرچہ پیشہ کے اعتبار پر ماہر تعمیرات ہیں مگر ان کی دلچسپی سیاست میں زیادہ ہے، خوب بولتے ہیں اور پاکستانی سماج کا اچھا تجزیہ کرتے ہیں۔ وسیم احمد سے میری واقفیت اس وقت سے ہے جب وہ پنجاب لوگ رہس میں تھے۔ میں اکثر ان کے ساتھ طاہرہ آپا کے یہاں لنچ پر جایا کرتا تھا۔ وسیم کے ادارے ''Inter active Theater'' نے میرے PTV کے پروگراموں کو U.Tube میں شامل کیا۔ پروفیسر شکیلہ رشید جو تاریخ کی استاد رہی ہیں۔ اب وہ پارلیمنٹ کی ممبر ہیں اور مصروف زندگی گزارتی ہیں ان سے فون پر رابطہ رہتا ہے۔

کراچی کے دوستوں کا ذکر ہو تو ان میں تسنیم صدیقی ہیں، جن سے واقفیت سندھ یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے سے ہے، مگر یہ سی۔ ایس۔ ایس کر کے غائب ہو گئے تھے۔ دوبارہ ان سے اس وقت ملاقات ہوئی ہے جب یہ حیدرآباد میں ایچ۔ ڈی۔ اے کے ڈائریکٹر ہو کر آئے اور کوٹری میں خدا کی بستی آباد کی۔ اب یہ خدا کی بستیاں بسانے کا کام کر رہے ہیں، حیدرآباد کے بعد سہون اور لاہور میں کالا شاہ کاکو میں یہ بستیاں ہیں۔ نواب سعید حسن خاں سے پہلے تو سردیوں میں ملاقات ہوتی تھی، کیونکہ گرمیاں یہ لندن میں گزارتے تھے، مگر اب ان کی گرمیاں بھی کراچی میں بسر ہونے لگی ہیں۔ نواب صاحب انسائیکلوپیڈیا ہیں، ہندوستان، پاکستان اور یورپ کے دانشوروں سے ان کے تعلقات ہیں اور ہر ایک کا شجرہ بتا دیتے ہیں۔ ان کی باتوں میں شگفتگی اور خوبصورتی ہوتی ہے کہ ان کے پاس بیٹھ کر وقت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ لاہور میں وہ علاؤ الدین صاحب کے ہاں قیام کرتے تھے، جو خود ایک اثر و رسوخ بیوروکریسی میں رہتے ہوئے درویش صفت انسان تھے، ان کی وفات کا انتہائی رنج ہے۔ اب نواب صاحب کا دورہ لاہور بھی کم ہو گیا ہے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر سید جعفر احمد کی شہرت اب یہ ہو گئی ہے کہ وہ بہت مصروف انسان ہیں، ہر وقت کسی نہ کسی منصوبہ کو پورا کرنے میں لگے رہتے

ہیں۔ ہر کام سلیقہ سے کرتے ہیں۔

ڈاکٹر توصیف احمد خاں، اردو یونیورسٹی میں شعبہ صحافت کے سربراہ ہیں۔ دو ایک سال میں جب کبھی کوئی کانفرنس کرتے ہیں تو تمام ریکارڈ توڑ دیتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ عامہ میں ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے۔ ڈاکٹر احمد سے میرے تعلقات جرمنی سے ہیں، اس وقت وہ یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں شور مچاتے نظر آتے تھے، دو پی۔ ایچ۔ ڈیز کے بعد پاکستان چلے آئے۔ پہلے آغا خاں یونیورسٹی میں پڑھایا، اور اب جناح میڈیکل کالج میں ہیں۔ ان کی بڑی خواہش ہے کہ لبرل آرٹس کی یونیورسٹی یا ادارہ قائم ہو۔ ان کی تنقید بڑی الجھی ہوئی ہوتی ہے، اس کو سمجھنے میں ذرا وقت لگتا ہے، جب سمجھ میں آجائے تو لطف آتا ہے۔ اب طاہرہ آپا کی جگہ یہ جب بھی میرا کالم پڑھتے ہیں تو فوراً فون کرتے ہیں۔ مجھے ان کے فون کا انتظار رہتا ہے۔

ڈاکٹر ریاض شیخ سے بالمشافہ ملاقات تو بعد میں ہوئی، مگر جب وہ جیکب آباد سے ایک ہفتہ وار یا ماہانہ اخبار نکالتے تھے تو مضامین کی فرمائش کرتے تھے۔ اب یہ ZABIST میں پروفیسر ہیں، ان کے تعاون سے ہم نے چودھویں تاریخ کانفرنس کی، اور اب اور منصوبے بنائے ہیں۔ انہوں نے اردو میں حمزہ علوی صاحب کے مضامین کا ترجمہ کیا ہے، اور مزید کر رہے ہیں۔ خالد محمود، محمود باویجہ، مجیب اور لیاقت ملک کے ساتھ محفلوں میں اچھا وقت گزرا۔ اب کراچی کے حالات نے ان محفلوں کو ختم کر دیا ہے۔

راحت سعید صاحب جب کوئی کام اپنے ذمہ لیتے ہیں تو اسے خوب نبھاتے ہیں۔ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی تنظیم قائم کر کے پورے ملک سے ترقی پسند ادیبوں کو اکٹھا کر لیا ہے۔ ابوالفضل صاحب اودھ کے چشم و چراغ ہیں، اس لئے ان سے بات کرتے ہوئے محتاط ہونا پڑتا ہے۔ فون پر اکثر ان سے طویل بات چیت ہوتی ہے اور بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ اقبال علوی صاحب پرانے ترقی پسند اور انتہائی دوست نواز ہیں، انہوں نے ارتقاء کے ادارے کو نئی زندگی دی، وہ سماجی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ جب بھی کراچی جانا ہو، فرمائش کر کے ان کے ہاں کھانا کھاتے ہیں۔ وہ شوق سے ہماری فرمائش پوری کرتے ہیں۔ رہے شمس الدین تو جب وہ کسی کام میں جٹ جاتے ہیں تو انہیں پھر کسی کی فکر نہیں ہوتی ہے۔ فرصت ملتی ہے تو دوستوں کو اکٹھا کر لیتے ہیں۔

عزیز میاں میرے رشتہ دار بھی ہیں اور ہم وطن بھی، اس لئے ان کا حق بنتا ہے کہ وہ ملنے پر یا فون پر جتنا چاہیں ڈانٹیں، اس سے رشتہ اور مضبوط ہوتا ہے۔ افسوس کہ کراچی میں اب کرامت شیر خاں نہیں رہے۔ ان کی اچانک وفات سے ہم سب دوستوں کو صدمہ ہوا، وہ ہمیشہ اپنے باغ میں لیجانے کی دعوت دیتے تھے۔ میرا دو مرتبہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا، اسے انہوں نے بڑی محنت سے سنوارا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ زمین سے رشتہ ہو، تو ملک سے محبت اور زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ زین علوی، جو حمزہ بھائی کے چھوٹے بھائی ہیں ان سے بھی مل کر مسرت ہوتی ہے۔

اسلام آباد میں اشفاق سلیم مرزا ہیں، جو فلسفہ، ادب، آرٹ اور فلم کے موضوعات پر دسترس رکھتے ہیں۔ اسلام آباد میں انہوں نے کلچرل سرگرمیوں کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ پاکستان کی ہر نئی بننے والی بائیں بازو کی پارٹی کا منشور انہیں سے لکھوایا جاتا ہے۔ ہمارے کرم فرما ایوب ملک جب کراچی میں تھے تو لوگوں کو جمع کر کے محفلیں منعقد کرتے تھے۔ اس کے بعد زور و شور سے مباحثے کراتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ٹاک شو کا خیال انہیں سے لیا گیا ہے۔ یہ خالد علیگ کو بھی بلا لاتے تھے اور رات کو آخری بس میں انہیں لانڈھی کے لئے چھوڑتے تھے۔ جاوید صدیقی بحثوں میں حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرتے تھے۔ ایوب ملک اب اسلام آباد میں عوامی پارٹی پاکستان کی تحریک میں سرگرم ہیں، اور بدلتی دنیا رسالہ پابندی سے نکال رہے ہیں، ان کی محفل کے اہم دوست کموڈور خامس بھی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ بحث میں حصہ بھی لیتے تھے اور فرمائش پر گانا بھی گاتے تھے۔ انہیں محفلوں میں ظفر موتی والا بھی برابر سے شریک ہوتے تھے، اور اپنے سرمایہ دارانہ خیالات کی وجہ سے بحث کا موضوع بنتے تھے۔ جب سے یہ اسلام آباد آئے ہیں، کراچی کی محفلیں سونی ہوگئی ہیں۔

ڈاکٹر ناظر محمود کراچی سے اسلام آباد چلے آئے ہیں جو میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہیں ان سے اور ان کی فیملی سے میری دلی وابستگی ہے، اور نصیر میمن بھی حیدر آباد سے اسلام آباد آ گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہمارے دوست مرکز کو مضبوط کر رہے ہیں۔

ہمارے دوست عیسیٰ داؤد پوتہ بھی اسلام آباد میں ہیں۔ ہمارا ساتھ سندھ یونیورسٹی

سے تھا، وہ امریکہ میں رہ کر اسلام آباد آ گئے۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے جعلی ڈگریوں کے بارے میں انکشاف کیا تھا کہ اسلام آباد میں وائس چانسلر سے لے کر بڑے بڑے اداروں کے ڈائریکٹروں کے پاس جعلی ڈگریاں ہیں۔ اس کی سزا یہ ملی کہ ان سب جعلی ڈگری والوں نے مل کر انہیں ملازمت سے نکلوا دیا۔ یہ ذرا لوگوں سے کم ملتے ہیں، اور لکھنے پڑھنے میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔

شہاب الدین صاحب میو قوم کی تاریخ لکھوانے کی دھن میں ہیں اور اب وہ خود بھی یہ تاریخ لکھ سکتے ہیں اس میں نعمت صاحب ان کے مشیر ہیں۔

کراچی نے حیدر آباد کو کھا لیا، میرے تقریباً سارے پرانے دوست حیدر آباد چھوڑ کر کراچی میں آباد ہو گئے۔ جن میں پروفیسر فریدالدین، ذکاء اللہ خان، ڈاکٹر وکیل قریشی، طارق ضمیر، اعجاز قریشی اور دوسرے واقف کار۔ اس لئے حیدر آباد میرے لئے سونا ہو گیا ہے۔ لیکن اب بھی وہاں حسین صمدانی، مومن خان، اظہر، مسعود جمال اور مہتاب نوجوان ساتھی ہیں، جو یاد کرتے ہیں اور جب حیدر آباد جانا ہو تو دوستوں کو اکٹھا کر لیتے ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میرے لئے اب خالی ہے۔ غلام محمد لاکھو کبھی کبھی یاد کر لیتا ہے۔

کھٹاؤ مل سے اس وقت سے واقفیت ہے جب وہ لیاقت میڈیکل کالج میں طالب علم تھا۔ یہ اور اس کے ساتھی ملنے یونیورسٹی آتے تھے۔ اب وہ مٹھی میں ہے، اور وہاں رہتے ہوئے پاکستان اور دنیا کے حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہے۔ تاریخ اور ادب پر خوب پڑھتا ہے۔ خدا بھلا کرے موبائل کا کہ اس کے ذریعہ رابطہ رہتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم نارو صاحب سے پہلی ملاقات جرمنی میں ہوئی تھی، پاکستان آ کر رابطہ رہا، اب وہ سیاست سے ریٹائر ہو کر رحیم یار خاں میں غریب بچوں کا ایک اسکول چلا رہے ہیں۔

میرے کالج اور یونیورسٹی کے ساتھی ظفر مسعود اب پیرس میں رہتے ہیں۔ پاکستان میں اس نے ڈان، لیڈر، اور بزنس ریکارڈر میں کام کیا۔ اب فرانس کے اخباروں میں لکھتے ہیں، اور اب ''ڈان'' میں بھی لکھنے لگے ہیں۔ ہمارے دوسرے پرانے دوست اسلم حیات شکاگو چلے گئے، جب میں مارچ 2012ء میں امریکہ گیا تھا تو فون پر بات ہوتی تھی، وہ وہاں خوش

نہیں ہیں، مگر بیوی بچوں کی وجہ سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔فون پر دیر تک اُن آل پاکستان مباحثوں کا ذکر کرتے رہے کہ جن میں ہم شریک ہوئے تھے۔

امریکہ ہی میں ہمارے دوست ظفر خضر ہیں، جو رہتے نیو جرسی میں ہیں مگر دل پاکستان میں ہے۔ان کے پاس کئی منصوبے ہیں، وہ کراچی کو دہشت گردوں سے نکالنے کے لئے پلان بنائے ہوئے ہیں، اور یہ کہ یہاں پر تعلیم کو کس طرح سے عام کیا جائے لیکن ان کی آواز پاکستان میں سننے والے نہیں ہیں۔

ان دوستوں کے علاوہ میرے بہت سے مداحین ہیں، جو پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور اکثر فون کرتے رہتے ہیں۔ان سے رابطہ کے نتیجہ میں حوصلہ ہوتا ہے کہ میرا لکھا بیکار نہیں جا رہا ہے۔اکثر لوگ ایئرپورٹ، بازار اور کانفرنسوں میں مل جاتے ہیں، اور محبت سے ملتے ہیں۔

آخر میں، میں عطیہ اور شہلا کو یاد کرتا ہوں، جو اب امریکہ میں مقیم ہیں، عطیہ شکاگو یونیورسٹی سے تاریخ میں PHD مکمل کر رہی ہے جبکہ شہلا نیویارک میں بطور وکیل پریکٹس کرتی ہے۔خدا بھلا کرے اسکائپ کا، کہ ان سے بیٹھ کر آمنے سامنے بات ہوتی ہے۔میرا بھتیجا نوید علی خاں آسٹریلیا میں ہے۔اسے بھی لکھنے اور پڑھنے کا شوق ہے، وہ بھی میری تحریریں برابر پڑھتا رہتا ہے۔اس کے ساتھ ہی آسٹریلیا میں ہمارے دوست خالد صغیر ہیں، جو برابر رابطہ میں رہتے ہیں، اور آسٹریلیا کے مسلمانوں میں روشن خیالی پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب میں یہ یادداشتیں لکھ رہا تھا، تو مجھے احساس تھا کہ ان میں نہ تو رنگینی ہے، اور نہ ہی چونکا دینے والی باتیں۔بہرحال جو یاد آیا وہ لکھ دیا۔شاید بہت سی باتیں لکھنے سے رہ بھی گئی ہوں گی چونکہ میرا ہر وقت خیال یہ تھا کہ لوگ پڑھ کر بور نہ ہوں۔لیکن یادداشتیں لکھنا ایک دلچسپ اور اذیت ناک عمل ہے۔یہ بار بار ماضی میں لے جاتا ہے، وہ ماضی ___ جو خوشگوار بھی تھا، اور تکلیف دہ بھی۔اس میں رشتہ داروں اور دوستوں کی بے وفائیاں بھی ہیں، تو دوستوں کی محبت اور ایثار بھی۔یہ بھی محسوس ہوا کہ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں۔یہ ایک نہیں ہے، یہ بدلتی رہتی ہے، ایک فرد اپنی مختصر زندگی میں کئی دنیاؤں

کے تجربوں سے گزرتا ہے۔ کبھی ایک دنیا کا خاتمہ افسردہ کرتا ہے، تو کبھی خوشی ہوتی ہے کہ دکھوں سے نجات پائی۔

یادداشتوں کو لکھتے وقت ذہن میں تمام یادوں کو زمان و مکاں کے دائرے سے نکال کر کاغذ پر لانا ہوتا ہے۔ ذہن اس میں مصروف رہتا ہے، جب یادداشتیں مکمل ہو جاتی ہیں تو ذہن بھی خالی ہو جاتا ہے، اور دل پر ایک افسردگی طاری ہو جاتی ہے کہ ایک طویل وقفہ کے بعد یادوں کے تسلسل سے محروم ہو گئے، اب پھر وہی تنہائی اور وہی زندگی۔ اب ذہن پھر کسی دوست اور ساتھی کی تلاش میں ہے کہ جو اسے مصروف رکھ سکے۔

ذکیہ مبارک کے ساتھ

شہلا۔عطیہ

نین تارا

مصحفی کے روپ میں

زمانۂ طالبِ علمی

بیقراری

میں جب بھی اپنے کمرے میں ہوتا ہوں، خود کو خاموش اور تنہائی میں گھرا ہوا پاتا ہوں، ایسے میں لکھنے پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے، مگر جب کتاب اور قلم سے دھیان ہٹتا ہے اور میں خود کو تنہائی میں پاتا ہوں تو ذہن اچانک یادوں سے بھر جاتا ہے۔ ایسے میں باہر دور سے کسی ٹھیلے والے کی آواز خاموشی کو توڑتی ہے یہ ٹھیلے والا سردی ہو یا گرمی زور زور سے آواز لگا کر اپنے پھل بیچتا ہے، میں نے اسے اب تک دیکھا نہیں ہے، مگر میں اس کی آواز سے مانوس ہوں، زور سے، چیختی ہوئی آواز سے، جو خاموشی کو توڑتی کمرے تک چلی آتی ہے، مگر جب پھر خاموشی ہوتی ہے تو میں اپنے بچپن کے زمانہ میں چلا جاتا ہوں، حیدرآباد سندھ کے مکان میں، کہ جہاں اماں کھانا پکانے میں مصروف ہیں اور میری یہ ذمہ داری ہے کہ دوپہر کا کھانا، چچا (والد) کے لئے پہنچاؤں، جب کھانا ٹفن میں رکھ دیا جاتا ہے، تو میں آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں کنگا کرتا ہوں، اور باہر جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں۔

ٹفن ہاتھ میں لے کر جب دروازے پر کھڑا ہوتا ہوں، تو سوچتا ہوں کہ کون سے راستہ سے جاؤں میرے الٹے ہاتھ کو راستہ روپ محل سے ہوتا ہوا، یہ ہیرا آباد کا پوسٹ آفس، اور پھر علی خاں روڈ سے ہوتا ہوا، کیفے اے ون، اور مارکیٹ ٹاور۔ یہ راستہ صاف، سیدھا اور اچھا ہے مگر لمبا ہے، میرے سیدھے ہاتھ والا راستہ شمشان گھاٹ سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔ یہ راستہ سنسان، ویران، اور خوف زدہ کرنے والا، راستہ میں گائے کے گوشت کی مارکیٹ ہے، یہاں ہوٹلیں ہیں کہ جہاں دور سے آنے والے کھانا کھاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر پر خشک مچھلیاں ٹنگی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں ادھر سے گزرتے ہوئے مجھے ہمیشہ اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ ڈر سا لگتا ہے۔ لیکن اکثر میں جلدی میں ہوا تو یہ راستہ اختیار کرتا ہوں، یہ ٹاور کے قریب گڑ مارکیٹ جاتا ہوا، یا تو

سبزی منڈی کے راستہ سے سرے گھاٹ جاتا ہے یا پھر ٹاور سے ہوتا ہوا، شاہی بازار۔

اس وقت چچا سرے گھاٹ پر کپڑے کی دوکان لگائے ہوئے تھے۔ یہاں اکثر گاؤں کے لوگ آتے تھے۔ سیدھے سادھے لوگ، دکاندار انہیں بھاؤ کہہ کر اپنی طرف بلاتے تھے۔ کپڑے کے اکثر تھان دھوپ میں رکھے ہونے کی وجہ سے پھیکے پڑ جاتے تھے۔ کورالٹھا اور سفید لٹھا ان کی خاص مانگ ہوتی تھی جب تک چچا کھانا کھاتے، میں دوکان پر بیٹھا رہتا تھا، جب میں واپس ہوتا تھا تو اس وقت میرے لئے راستہ کا انتخاب ایک ہی تھا، ٹاور سے ہوتا ہوا، ہیرا آباد سے گزرتا ہوا، کیونکہ ٹاور کے قریب اخباروں اور رسالوں کے اسٹال تھے، میں یہاں رک کر بچوں کے رسالے دیکھتا تھا، اگر پیسے ہوتے تو خرید بھی لیتا تھا، یہاں آمنے سامنے دو ہوٹلیں تھیں، جو مقابلے کے طور پر زور سے فلمی گانے بجاتی تھیں ___ نہ جانے کیوں جب میں اسٹال پر رکتا ___ شمشاد بیگم کا گانا اکثر بجتا تھا ___ ''بڑی مشکل سے دل کی بے قراری کو قرار آیا'' ___ آج بھی یہ گانا میری یادوں میں محفوظ ہے، اور میں جب بھی اسے سنتا ہوں، اس لمحہ خود کو اسٹال پر کھڑا رسالے دیکھتا ہوا پاتا ہوں، اور ساتھ ہی میں سوچتا ہوں کہ اتنے برس گزر گئے، آخر اس طویل عرصہ میں میرے دل کو قرار کیوں نہیں آیا۔

(1)

شاید قرار اس وقت آتا ہے کہ جب سوچنا بند کر دیا جائے۔ اگر ذہن سوچتا رہے تو پھر قرار کہاں، پھر تو بیقراری ہے، جستجو ہے، تفتیش ہے، تحقیق ہے، اور جب یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر رکتا نہیں ہے، دروازے پر دروازے کھلتے رہتے ہیں، انسان بھول بھلیوں میں گرفتار ہوتا رہتا ہے، بیقراری بڑھتی رہتی ہے، کم ہونے کا نام نہیں لیتی ہے، ذہن میں سوالات اٹھتے ہیں، جواب ملتے ہیں، مگر جوابات میں سوال چھپے ہوتے ہیں۔ یہ لامتناہی سلسلہ ہے، جو ہمیشہ چلتا رہتا ہے، اور سوالات و جوابات ختم نہیں ہوتے، ایک سوال کا جواب ملتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے، شاید یہی زندگی ہے، کہ انسان مسلسل بیقرار رہتا ہے۔

مگر ایک وقت تھا کہ مجھ میں یہ بیقراری اتنی شدید نہیں تھی کہ جتنی آگے چل کر ہوئی، مجھے اب اپنا بچپن یاد آتا ہے، ٹونک کا شہر، اور وہاں کا معاشرہ۔ یہ روایتی معاشرہ تھا کہ جس میں مسلمان

مذہبی طور پر عقائد اور رسومات کے پابند تھے، نماز، روزے کی پابندی کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اگر چہ گھر کا ماحول بہت مذہبی نہ تھا، مگر ماحول نے مجھے نماز روزے کا پابند کر دیا۔ پانچوں وقت کی نماز باجماعت۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا۔ چچا کو طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ قسم کی کتابوں کا شوق تھا کہ جن میں طلسماتی کرشمے ہوتے تھے، ابتداء میں تو میں نے وہی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اولیاء کی سیرتیں، تو ان میں اور طلسماتی کہانیوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ اولیاء کی سیرتوں میں ان کی کراماتیں تھیں، ہواؤں میں اڑنا، پانی پر چلنا، ایک ہی وقت میں کئی جگہ نظر آنا، اس نے اس سوچ کو پیدا کیا کہ کیا مجھ میں بھی یہ صلاحیت اور طاقت آسکتی ہے؟ کیا میں بھی ولی بن سکتا ہوں؟ اس کی ابتداء عجیب وغریب تجربوں سے ہوئی، کسی نے کہا کہ فلاں آیت پڑھ کر آگ ہاتھ میں لو تو وہ اثر نہیں کرتی ہے۔ میں کئی دنوں تک اس تجربہ میں مصروف رہا مگر ہر بار ہاتھ جل جاتا تھا، اور خیال یہی ہوتا تھا کہ میں نے شاید آیت صحیح نہیں پڑھی ہے۔

کبھی کبھی پیشین گوئی کرنے کی کوشش کرتا، آنکھیں بند کر کے سوچتا کہ بادل آرہے ہیں، مگر جب آنکھیں کھولتا تو آسمان صاف نظر آتا۔ جب سارے تجربات ناکام ہوئے تو دل بیٹھ گیا کہ آخر مجھ میں کون سی کمی ہے، خرابی ہے یا نقص ہے۔

لہٰذا عبادت میں مشغول ہو گیا۔ طویل سجدے، محویت اور جذب کی کیفیت طاری کرنا، مگر لاحاصل، کوئی کرامت ظاہر نہیں ہوئی۔

پاکستان آنے کے بعد یہ سب کچھ چھوٹ گیا۔ بالکل ہی نیا ماحول تھا، اس عرصہ میں، میں سخت بیمار ہو گیا جس کی وجہ سے پڑھائی وغیرہ بھی ترک ہو گئی، بیمار اگر چہ بہت تھا، مگر اس وقت تک موت کے بارے میں کبھی خیال نہ آیا کہ میں بیماری کے نتیجہ میں مر بھی سکتا ہوں۔ موت کا خیال عمر کی پختگی کے بعد ہی آتا ہے۔ شروع کی زندگی میں مرنے سے ڈر نہیں لگتا، کیونکہ زندگی میں کچھ دیکھا نہیں ہوتا ہے، اس لئے زندگی اور موت کا فرق زیادہ اہم نہیں، مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے زندگی میں پختگی آتی ہے، اسی طرح سے زندگی سے لگاؤ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس وقت موت کا شعور بھی پیدا ہوتا ہے مگر انسان زندہ رہنا چاہتا ہے۔ موت کی خواہش اسی وقت ہوتی ہے جب بڑھاپا اس حد تک پہنچ جائے کہ انسان دوسروں کا محتاج ہو جائے، اس وقت موت تمام مسائل کا حل ہوتی ہے، اپنے لئے بھی اور خاندان کے لئے بھی۔

ہمارے معاشرے میں انسان کے کردار اور اس کی خوبیوں کو اس کے مذہبی لگاؤ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے لوگوں کی نظروں میں خود کو معزز بنانے کے لئے مذہبی ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ہم تاریخی شخصیتوں کے کردار کے بارے میں ذکر کرتے ہیں تو یہ ضرور کہتے ہیں کہ بلبن بڑا نمازی، پرہیزگار اور تہجد پڑھنے والا تھا، علماء کی قدر کرتا تھا، یا ناصرالدین محمود نیک و پارسا تھا، ٹوپیاں سی کر گزارا کرتا تھا، اور یا اورنگ زیب زاہد و متقی تھا۔ اس کا یہ مذہبی کردار، اس کی تمام برائیوں، عیبوں اور خرابیوں کو اپنے لپیٹ لیتا ہے۔

ہمارا اور آپ کا یہ مشاہدہ ہے کہ لوگ زندگی بھر دنیا بھر کی برائیوں میں مبتلا رہتے ہیں، رشوتیں لیتے ہیں، بدعنوانیوں میں ملوث ہوتے ہیں، مگر ریٹائر ہوئے، یا عمر کے آخری حصے میں پہنچے کہ ان کی زندگی میں تبدیلی آئی، حج کیا، اور پانچوں وقت کے نمازی ہو گئے، لوگوں میں شہرت ہوگئی کہ نیک راستہ پر آ گئے، خدا نے توفیق دیدی، لہٰذا سارے گناہ اسی دنیا میں معاف ہو گئے۔

شاید اسی لئے یہ جذبہ مجھ میں ایک بار پھر پیدا ہوا کہ میں مذہبی ہو جاؤں، کیونکہ اس طرح میں اپنے ساتھیوں میں ممتاز ہو جاؤں گا۔ نمازی، پرہیزگار، اس چھوٹی سی عمر میں اس قدر مذہب کی پابندی، میری یہ حالت اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک رہی، اس دوران میری مذہبی زندگی کے تجربات دلچسپ ہیں، میں نماز کا سخت پابند ہو گیا تھا۔ راستہ میں نماز کا وقت ہوا، جو مسجد قریب میں آئی، وہاں جا کر نماز پڑھی، ایک مرتبہ حیدرآباد میں اسٹیشن کے قریب شیعہ مسجد تھی وہاں چلا گیا، لیکن جب وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑا ہوا تو دیکھا کہ مسجد کے سارے لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے ایک عجیب سا خوف محسوس ہوا کہ شاید میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شیعوں کی مسجد ہے، اگرچہ کسی نے کہا کچھ نہیں، مگر حیرت سب ہی کو تھی۔

اسی طرح ایک مرتبہ کوئٹہ جانا ہوا، جمعہ کی نماز کے لئے میں قریبی مسجد میں گیا، مجھے دیکھ کر وہاں پر موجود ایک صاحب نے بڑی شائستگی سے کہا کہ میں کہیں اور جا کر نماز پڑھوں ___ مجھے حیرت تھی کہ کیوں؟ یہاں کیوں نہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ احمدیوں کی مسجد تھی، لہٰذا ہر مسجد کا نیا تجربہ ہوتا تھا۔ اہلِ حدیث کی مسجد میں نمازی زور سے آمین کہتے تھے، اگر آپ خاموش رہیں تو وہ ناراض ہوتے تھے۔ ایک آدھ بار ننگے سر نماز پڑھنے کی کوشش کی تو کسی صاحب نے اپنا رومال یا ٹوپی

سر پر رکھ دی، وضو کے بارے میں قریب کے لوگ غور سے دیکھتے تھے، کہنیاں سوکھی رہ گئی ہیں، پاجامہ ٹخنوں سے اوپر ہونا چاہئے، وغیرہ۔

جب آدمی مذہبی ہوتو اسے دوسرے تمام غیر مذہبی لوگ صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خواہش ہوتی ہے کہ انہیں سب کو راہِ راست پر لایا جائے۔ اگرچہ ظاہر میں تو بڑی انکساری اور عجز ہوتا ہے، مگر اندر سے خود کو پاک و پارسا سمجھ کر دوسروں کے لئے اچھے خیالات نہیں ہوتے ہیں۔

پھر میرے اندر کش مکش شروع ہوئی، سوالات پیدا ہونا شروع ہوئے کہ عبادت کا فائدہ کیا ہے؟ کیا یہ اچھے کردار کے لئے ضروری ہے، اور یا اچھا کردار بغیر عبادت کے بھی ہوسکتا ہے؟ میں اس وقت یونیورسٹی میں تھا، ایم۔اے کر کے پڑھانا شروع کیا تھا۔ اسی دوران اناطول فرانس کا مشہور ناول ''تھائی'' پڑھا، اس نے ذہن میں کئی سوالات کو پیدا کیا؟ نیکی اور بدی آخر کیا ہیں؟ عبادت وریاضت کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ ایک عابد و زاہد، انسانی معاملات میں بہت خراب اور بدطینت ہوسکتا ہے۔ ایک گناہ گار بڑا اچھا انسان ہوسکتا ہے، تو پھر مذہب کیوں ضروری ہے؟

میں نے یہی سوال اپنے استاد ڈاکٹر بشیر سے کیا کہ کیا اچھے اخلاق کے لئے عبادات ضروری ہیں؟ یا مذہب اچھے کردار کو بنانے میں مدد دیتا ہے؟ تو انہوں نے کہا، نہیں! ایک غیر مذہبی شخص بھی اچھے کردار اور اخلاقیات کا حامل ہوسکتا ہے۔

(2)

ہر معاشرے میں اس کی اپنی روایات ہوتی ہیں کہ جس کے حصار میں وہ خود کو محفوظ کر لیتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان روایات کا تعلق طبقاتی مفادات سے ہوجاتا ہے، اور وہی اس کے سب سے بڑے محافظ ہوجاتے ہیں۔ اگر کوئی ان روایات سے بغاوت کرے تو وہ معاشرے کے حصار سے باہر چلا جاتا ہے، اور معاشرہ اسے اجنبی بنا کر اس کا بائیکاٹ کر دیتا ہے۔ ان حالات میں باغی افراد کے لئے زندگی مشکل ہوجاتی ہے۔ ان کا کردار لوگوں کی نظروں میں مشکوک ہوجاتا ہے، وہ اچانک اپنوں کے بجائے غیر ہوجاتا ہے۔

اس صورت حال سے بچنے کے لئے کچھ لوگ کہ جو روایات کو دل سے تو نہیں مانتے ہیں، مگر معاشرے میں رہنے کے لئے، ان پر عمل کرتے ہیں، ان سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں، جو یہ سمجھوتہ نہیں کرتے، معاشرہ انہیں کئی طرح کے خطابات سے نوازتا ہے، اگر مذہبی روایات سے انکار ہو تو ملحد، دہریہ، کافر، مرتد، اگر قومی روایات سے انکار ہو تو ایجنٹ۔ اگر سماجی روایات سے انکار ہو تو غیر مہذب، بداخلاق، بدمعاش، بے شرم اور اخلاق باختہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

میری دنیا

قدرت کا عجیب وغریب فیصلہ ہے کہ یہ فردکی قسمت ہے کہ وہ کب پیدا ہوتا ہے، کہاں پیدا ہوتا ہے، اور کس عہد یا زمانہ میں پیدا ہوتا ہے؟ اگر وہ خوش قسمت ہے تو اس صورت میں وہ کسی ترقی یافتہ، خوش حال معاشرے میں پیدا ہوگا کہ جہاں وہ زندگی کی مسرتوں سے ہم کنار ہو سکے گا۔ اگر اس کی قسمت نے ساتھ نہ دیا تو وہ ایک پس ماندہ معاشرہ میں پیدا ہو کر محرومیوں کا سامنا کرتا ہے۔ لیکن اس پر ہی بس نہیں یہ بھی اس کی قسمت ہے کہ وہ کسی امیر اور اعلیٰ طبقہ کے خاندان میں پیدا ہوگا، کہ جہاں ترقی کے تمام راستے اس کے لئے کھلے ہوں گے، یا وہ کسی غریب گھرانہ میں پیدا ہو کر امراء اور طبقہ اعلیٰ کی غلامی کرتا رہے گا۔

اس قسمت کی وجہ سے باصلاحیت افراد پس ماندہ معاشرے میں اجنبی بن کر رہ جاتے ہیں کہ جہاں ان کی بات سننے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کم ذہن کے لوگ ترقی یافتہ معاشرے میں زندگی کا سکون اور اطمینان پا لیتے ہیں۔

اس لئے آج کے اس گلوبل زمانے میں قابل، ذہین افراد اپنے پس ماندہ معاشرے کو چھوڑ کر کوشش کرتے ہیں کہ کسی ترقی یافتہ معاشرہ کا حصہ بن جائیں، ان لوگوں کے جانے سے ان کا معاشرہ اور زیادہ پس ماندہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ میرے سامنے یہ دو دنیائیں تھیں۔ میں ایک پس ماندہ معاشرہ میں ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوا کہ جہاں زندگی گزارنے کے لئے محنت ومشقت، اور سختیاں تھیں کچھ عرصہ میں نے ترقی یافتہ دنیا میں گزارا کہ جہاں سکون وامن، اور اطمینان تھا، پھر نہ جانے کیوں میں اس کو چھوڑ کر اپنی دنیا میں واپس آ گیا کہ شاید یہاں میں اپنے لئے کوئی جگہ بنا سکوں۔ افسوس کہ میں اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ مگر میں نے پھر مڑ کر دوسری دنیا کو نہیں دیکھا، اور اپنی دنیا میں آباد ہو گیا۔

میرا بچپن ٹونک میں گزرا، جو ایک چھوٹا سا شہر تھا، آبادی کم تھی، لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس لئے وہاں خاندان کی پہچان تھی کہ آپ کا تعلق کس خاندان سے ہے۔ یہاں زندگی سادہ اور ایک لحاظ سے آرام دہ تھی۔ شہر میں ہندو بھی تھے جن کی اکثریت کاروباری تھی، پرچونوں کی دوکانوں سے لے کر کپڑے اور دیگر اشیاء کا کاروبار یہ لوگ کرتے تھے۔ گاؤں میں لوگوں کی اکثریت کا تعلق کسانوں سے تھا۔

چونکہ ریاست کا نواب مسلمان تھا، اس لئے ریاست کی شناخت بھی مذہب سے ہوتی تھی۔ ریاست کی سرپرستی کی وجہ سے اکثر دوسرے علاقوں کے مسلمان یہاں کر آباد ہوئے، ان میں علماء کی بڑی تعداد تھی، اس لئے یہاں پر مدارس بہت تھے جہاں مذہبی تعلیم ہوتی تھی، مگر شہر میں دربار ہائی اسکول بھی تھا کہ جو سیکولر تعلیم کا مرکز تھا۔ ابھی یہاں کالج کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ اس وجہ سے متوسط درجہ کے مسلمان اپنے بچوں کو علی گڑھ یا الہ آباد بھیجا کرتے تھے۔ عورتوں کو تعلیم دینے کا رواج کم تھا، بہت ہوا تو قرآن شریف پڑھا دیا۔ پردہ کی سخت پابندی تھی۔ عورتیں برقعے اوڑھ کر بھی گھر سے نہیں نکل سکتی تھیں۔

میرے آتے آتے نواب اور ان کا خاندان انتہائی پس ماندگی کا شکار ہو چکا تھا۔ نواب کے خاندان والوں کو صاحب زادہ کہا جاتا تھا، یہ لفظ ایک طرح سے منفی معنوں میں استعمال ہونے لگا تھا، یعنی اس سے مراد یہ لی جاتی تھی کہ یہ نااہل، سست اور عیاش ہیں، اور ہوا بھی یہ کہ جب نوابی ختم ہوئی اور ان کے وظیفے یا جائیدادیں چھن گئیں تو صاحب زادوں کے خاندان انتہائی کسمپرسی، غربت اور مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

اس معاشرہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بزرگوں کا احترام کیا جاتا تھا نوجوانوں پر ان بزرگوں کی نگاہ رہتی تھی، اس گھر اور باہر کے ماحول میں نوجوانوں کے لئے اخلاقی حدود سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ مدرسوں میں استادوں کا رویہ پُرتشدد ہوا کرتا تھا۔ بچوں کو سخت مارا اور پیٹا جاتا تھا۔ ان کا کھانا بند کر دیا جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں مدارس کے استادوں کا یہ رویہ ہر جگہ ایک ہی جیسا ہے۔ ان میں ذرا بھی محبت اور شفقت نظر نہیں آتی ہے۔

لباس بھی سادہ ہوتا تھا، کُرتا اور علی گڑھ کٹ پاجامہ۔ نوجوان تو اس لباس میں رہتے تھے مگر دفتر جانے والے اس پر شیروانی پہن لیتے تھے۔ سر پر انگریزی ہیٹ رکھنے کا رواج نہیں

تھا۔ٹوپی یا پگڑی کا استعمال ہوتا تھا۔ ننگے سر کوئی باہر نہیں نکلتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے،شہر میں ہوٹلیں نہیں تھیں۔ بھٹیاریوں کی دوکانیں ہوتی تھیں جہاں لوگ کھانا کھاتے تھے۔ مجھے ایک ٹھیلے والا یاد ہے کہ جو کباب اور کوفتے تلتے ہوئے ان پر روئی کی پھریری سے ہلکا سا گھی لگاتا تھا اور ہلکی آنچ میں انہیں تلتا تھا، تاکہ گھی کا خرچہ کم ہو۔ چائے پینے کا رواج بھی بہت کم تھا۔مہمانوں کی تواضع پان سے کی جاتی تھی یا ان کے آنے پر ان کے کپڑوں پر عطر لگا کر خوش آمدید کہا جاتا تھا۔

اگرچہ مسلمانوں کا مذہبی ماحول تھا،مگر کبھی مذہبی جھگڑوں اور فرقوں کے بارے میں نہیں سنا۔ دفتر اور اسکول میں کام کرنے والے ہندو بڑی اچھی فارسی اور اردو جانتے تھے۔میرے زمانے تک ہندو مسلم فرقہ واریت کی فضا نہیں تھی۔

1952ء میں جب پاکستان آئے تو حیدرآباد سندھ میں آ کر آباد ہوئے۔ ہجرت کے ساتھ ہی میری بچپن کی دنیا جو ٹونک سے وابستہ تھی وہ ختم ہوگئی اور ایک نئی دنیا سے روشناس ہوئے۔ 1952ء میں حیدرآباد بھی کوئی بڑا شہر نہیں تھا،اور یہاں ہندوستان سے آنے والوں کی بڑی تعداد آباد ہوچکی تھی۔سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ یہاں کے ماحول میں ہماری خاندانی شناخت ختم ہوگئی، اب والد یا ان کے خاندان کو جاننے والا کوئی نہیں تھا،اور یہی حال ہمارا تھا۔دوسرے یہ ہوا کہ ہم جو ایک ماحول کے عادی تھے وہ ختم ہوگیا۔ یہاں ہندوستان کے ہر علاقہ سے آئے ہوئے لوگ تھے، اور پھر حیدرآباد میں سندھیوں کے پرانے محلے تھے،اس نئے ماحول میں ہم پریشان ہوگئے۔ یہاں مقابلہ بازی تھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کشمکش تھی،سازشیں اور جھوٹ وفریب کے ہتھکنڈے تھے ان سب سے نمٹنے کی صلاحیت ہم میں نہیں تھی،اس لئے والد کو روزی کمانے اور خاندان کے لئے ذرائع مہیا کرنے میں ناکامی ہوئی۔

اب میں سوچتا ہوں کہ اگر ہم حیدرآباد میں نہیں ہوتے اور سندھ کے کسی چھوٹے شہر میں ہوتے تو ہم یونیورسٹی تک نہیں پہنچ سکتے تھے،کیونکہ والد اس قابل نہیں تھے کہ ہمیں ہاسٹل میں رکھتے اور یونیورسٹی کی فیس دیتے۔اس لئے یہ حالات کا بہاؤ ہوتا ہے کہ کبھی کسی کے حق میں ہوجاتا ہے اور کبھی اس کے خلاف۔ایک فرد اس بہاؤ میں بےبس اور مجبور محض ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک مفروضہ ہے کہ محنت سے سب کچھ حاصل ہوجاتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو محنت کرتے ہیں،مگر انہیں سازگار

ماحول نہیں ملتا ہے اوران کی محنت بیکار جاتی ہے۔

1950ء کی دہائی میں ملک میں سیاسی سرگرمیاں تھیں۔ سیاسی لیڈرز حیدرآباد بھی آتے تھے۔ یہاں نور محمد ہائی اسکول کے ہاسٹل کے پیچھے بڑا میدان تھا جواب کچی آبادی میں تبدیل ہو گیا ہے، یہاں یہ جلسے ہوا کرتے تھے۔ شہر کے لوگ بڑی تعداد میں یہاں جمع ہوتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ سردار عبدالرب نشتر کی تقریر سنی ہے، وہ بڑے اچھے مقرر تھے جب وہ تقریر کررہے تھے تو شاید مخالف پارٹی کے کچھ لوگوں نے جلسے میں افراتفری کی خاطر کھڑے ہوکر جانا شروع کردیا۔ سردار نشتر نے فوراً کہا، حضرات ان لوگوں کو جانے کے لئے جگہ دیں، شاید یہ اہم ضروریات پوری کر کے واپس آجائیں۔ لوگوں میں ہنسی دوڑگئی اور سب خاموشی سے بیٹھ گئے۔ اس وقت سیاسی لیڈرز چاہے وہ کسی جماعت کے ہوں سنجیدہ لہجہ میں تقریر کرتے تھے چیختے نہیں تھے اور نہ ہی شور مچاتے تھے۔ ان میں سے بعض تو فن خطابت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ صاف ستھرے لہجہ میں، روانی کے ساتھ بولتے تھے اور لوگ خاموشی سے سنتے تھے۔

شاید یہ 1957ء یا 1958ء کی بات ہے، حسین شہید سہروردی وزیراعظم پاکستان حیدرآباد آئے۔ ہمارے پرنسپل مرزا عابد عباس یونین کے عہدیداروں کو لے کر، جن میں، میں بحیثیت فرسٹ ایئر کلاس نمائندہ کی حیثیت سے شامل تھا، سرکٹ ہاؤس لے کر گئے۔ یہاں دوسرے کالجوں کے طالب علم بھی موجود تھے۔ سہروردی صاحب نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر تقریر کی، جس میں ملک کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے، طالب علموں سے حمایت کی درخواست کی۔ اس کے بعد انہوں نے جلسہ عام سے بھی خطاب کیا، مگر وہ زیادہ عرصہ وزیراعظم نہیں رہے اور جلد ہی انہیں سیاسی حریفوں کے ہاتھوں شکست کا سامنا ہوا۔

جب ایوب خاں نے مارشل لاء کا نفاذ کیا، اس وقت میں انٹر کا طالب علم تھا۔ کسی نے جب یہ خبر سنائی تو میں اس کا پورا مطلب نہیں سمجھ سکا کہ مارشل لاء کیا ہوتا ہے۔ اس کا احساس اس وقت ہوا کہ جب ہر جگہ صرف فوجی نظر آئے، فوجی عدالتیں قائم ہوئیں، سیاسی جماعتوں پر پابندی لگائی گئی اور جیسے جیسے ان کا دور بڑھتا گیا مارشل لاء کے جبر کے پہلو سامنے آتے گئے۔ طلباء یونین پر پابندی ہوئی، نئی تعلیمی پالیسی بنائی گئی۔ استادوں اور طالب علموں کی نگرانی ہونے لگی۔ ان اقدامات کی وجہ سے طالب علموں میں ایوب خاں کے خلاف سخت ردعمل پیدا ہوا۔ اگرچہ کراچی

کے طالب علموں کی طرح حیدر آباد میں کوئی تحریک تو نہیں تھی، مگر طالب علموں نے کراچی کے ساتھیوں کا ساتھ دیا۔

مارشل لاء کے کلچر میں خوشامد کا عنصر بڑی تیزی کے ساتھ ابھرا، یونیورسٹی اور اس سے باہر ایسے لوگ موجود تھے جو ایوب خاں کی تعریف کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانہ میں ریڈیو پاکستان کی خبروں کی ابتداء اس جملہ سے ہوتی تھی کہ ''صدر ایوب نے کہا ہے'' جب ان کی کتاب، جس کا اردو ترجمہ ''اے طائر لاہوتی'' کے عنوان سے شائع ہوئی تو اخباروں اور ریڈیو پر اس کی تعریف و توصیف میں مقالے شائع ہوئے اور لیکچرز دیئے گئے۔

جب دس سال پورے ہونے پر جشن منایا گیا تو سندھ یونیورسٹی میں بھی اس کا اہتمام ہوا اور ایوب خاں کے دورِ حکومت کے کارناموں کی تفصیلات بیان کی گئیں۔ حالانکہ اس وقت ان کے خلاف عوامی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی تھی، جس کے باعث انہیں اقتدار چھوڑنا پڑا۔

خوشامد کا فن دربار کی پیداوار ہے، اور یہ ایسے ماحول میں خوب پھلتا پھولتا ہے کہ جہاں اختیارات اور اقتدار کسی ایک شخص کے پاس ہوں۔ ترقی اور فوائد کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ با اقتدار شخص کی تعریف و توصیف کر کے اس کی حمایت حاصل کی جائے اور اپنی ضرورت کے لئے فوائد حاصل کئے جائیں۔ خوشامد ان حالات میں ایک ایسا موثر ہتھیار ہو جاتا ہے کہ جو کامیابی کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں ذہانت اور قابلیت کی اہمیت نہیں رہتی ہے۔ جب خوشامدیوں میں مقابلہ ہو تو ہر ایک یہ کوشش کرتا ہے کہ ایک دوسرے سے بازی لے جائے۔ اکبر کے دربار میں جب اس پر بحث ہوئی کہ دربار کے آداب میں بادشاہ کو سجدہ کرنا چاہئے یا نہیں، تو کچھ نے کہا کہ سجدہ تعظیمی مذہب میں جائز ہے۔ اس پر دوسرے علماء کو افسوس ہوا کہ انہیں یہ بات کیوں نہیں سوجھی!

خوشامد کے اس فن میں قصیدہ کی روایات کو اہمیت ملی، اور شاعروں کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے ممدوح کی شان میں ایسے قصیدے کہیں کہ سننے والے حیران رہ جائیں۔ قصیدوں میں بے بس، اور مجبور بادشاہ کو رستم و سہراب سے ملایا گیا، اور ان کی فیاضی کو قارون اور عدل کو نوشیرواں سے تشبیہہ دی گئی تو صورت حال بڑی مضحکہ خیز ہو گئی۔

بہر حال یہ خوشامد، مارشل لاء دور میں خوب پھلی پھولی، ایوب خاں کبھی مشرق کے ڈیگال

ہوئے اور کبھی فیلڈ مارشل۔ پھر یہ خوشامد اوپر سے نیچے کی جانب آتی چلی گئی۔ دفتروں میں افسروں کی خوشامد ہونے لگی تو یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر اور صدر شعبہ اس کے مرکز بن گئے۔ معاشرہ میں یہ کلچر اس قدر تیزی سے پھیلا کہ اس کے بغیر کامیاب ہونا ناممکن ہوگیا۔

پاکستان میں ایسے باکمال افراد موجود ہیں کہ جنہوں نے خوشامد کے فن کو اپنے عروج پر پہنچا دیا ہے۔ یہ لوگ ضیاء الحق کے زمانے میں بھی اعلیٰ عہدوں پر رہے اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ انہوں نے خود کو بعد میں جمہوریت کا چیمپین بنالیا جب مشرف برسر اقتدار آئے تو یہ لوگ لبرل ازم کے نام پر اس کے حامی ہو گئے، ایک بار جب کسی نے کسی اعلیٰ عہدیدار سے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے اردگرد جو لوگ جمع ہیں، یہ آپ سے پہلے کے صاحب اقتدار کے اتنے ہی حامی تھے جتنے آپ کے ہیں تو اس نے کہا، ہمیں ایسے ہی بے شرموں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صحیح بھی ہے، کیونکہ جو نااہل اقتدار میں آجائیں، انہیں بے شرم اور نااہل ہی لوگ چاہئے ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ اصول پسند لوگ نہیں چل سکتے۔ کیونکہ وہ ان کے ہر جائز اور ناجائز حکم کو ماننے پر تیار نہیں ہوں گے۔

ایک ایسا معاشرہ، جیسا کہ پاکستان کا ہے، وہاں خوشامدی حضرات کبھی ناکام نہیں ہوتے ہیں۔ ہاں، ان کے ممدوح ضرور اس وقت تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ جب وہ اقتدار سے محروم ہو جاتے ہیں، اور صاحب اختیار نہیں رہتے ہیں۔ اس وجہ سے بیوروکریسی ہو، یا فوج اس میں اعلیٰ عہدیداروں کی کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ کبھی ریٹائرڈ نہ ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد عہدے پر رہنے کے لئے انہیں بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ ایک مرتبہ سندھ میں ایک نوجوان نے شکایتاً کہا کہ سندھ میں ہمارے اداروں پر ریٹائر حضرات کا قبضہ ہے۔ اب ہماری باری کب آئے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن کی سفارش نہیں ہے، یا جو خوشامد کے حربوں سے واقف نہیں ہیں، وہ ترقی نہیں کر پاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ جو لوگ بااختیار ہوتے ہیں، ان میں رعونت بھی آجاتی ہے۔ ان کی شخصیت کو تسکین یا تو خوشامد سے ملتی ہے، یا اپنے ماتحتوں کو ذلیل کر کے اپنی طاقت اور اختیارات کے اظہار سے۔ لیکن جب یہ لوگ ریٹائر ہو کر گھر آتے ہیں تو ان کی اہمیت ایک دن میں ختم ہو جاتی ہے اور ان کی شخصیت سکڑ کر رہ جاتی ہے۔ بہت کم ایسے عہدیدار ہیں کہ

جنہوں نے اپنے اختیارات کو عوام کی فلاح کے لئے استعمال کیا۔ یہ لوگ بعد میں بھی قابلِ احترام رہتے ہیں۔

اس صورت حال میں معاشرہ میں جو ذہنیت پرورش پاتی ہے وہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح سے اقتدار حاصل کیا جائے اور پھر اختیارات کو استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کی جائے۔

رشوت کا رواج تو ہمارے معاشرے میں بہت پرانا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں قدیم ہندوستان اور عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ملتی ہیں۔ مغل امراء رشوت کے معاملہ میں بڑے فراخ دل تھے۔ یورپی سیاحوں کے مطابق تجارت میں سہولت کی خاطر وہ انہیں رشوتیں دیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نور جہاں کا باپ اعتمادالدولہ رشوت لینے میں بڑا دلیر تھا۔ کیونکہ جہاں گیر اس کا داماد تھا، اسے کسی سے ڈر اور خوف نہ تھا۔ رشوت کو انگریز بھی نہیں روک سکے۔ بلکہ اپنے ابتدائی دور میں کمپنی کے عہدیدار سخت رشوت خور ہوا کرتے تھے۔ کولونیل دور کے ادارے پولیس، نوکرشاہی، اور نچلی عدالتوں میں رشوت عام تھی، جو تقسیم کے بعد بھی جاری رہی۔

یہ ضرور ہے کہ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں رشوت کو برا سمجھا جاتا تھا، اور رشوت لینے والا اس کو ظاہر نہیں کرتا تھا۔ عام لوگوں میں یہ تاثر تھا کہ راشی کے گھر کھانا و پینا جائز نہیں ہے۔ یہ معاشرہ کا دباؤ تھا کہ لوگ خاموشی سے رشوت لیتے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ رویہ بدلتا گیا، اور اب یہ وقت آ گیا کہ رشوت لینا نہ صرف جائز ہو گیا ہے بلکہ اس کو ایک ضرورت سمجھا جاتا ہے کہ جس کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔

جب اختیارات ختم ہو جائیں تو دولت افراد کو بااختیار بھی بنا دیتی ہے اور وہ معاشرہ میں قابل عزت بھی ہو جاتے ہیں، اس کو پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے کہ جب معاشرے میں دولت عزت و وقار، تعظیم کی بنیاد بن جائے، اور فرد کی ایمانداری و دیانت کی اہمیت نہیں رہے تو اس صورت میں لوگ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت حاصل کر کے باعزت بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو اس دوڑ میں کامیاب ہو جاتے ہیں، وہ لوگوں کے لئے ''رول ماڈل'' بن جاتے ہیں۔ ان کی مثالیں دی جاتی ہیں کہ کس طرح چند سالوں میں اس نے کروڑوں کی دولت حاصل کی۔ لہٰذا دولت کے اس حصول میں زمینوں پر قبضہ کرنا، جعلی دوائیں تیار کرنا، اشیاءِ خوردونوش میں ملاوٹ کرنا، اور دھوکہ وفراڈ سے بیوقوف بنانا، یہ سب جائز ہو جاتا ہے۔

پھراس دولت کو پاک کرنے کی خاطر یہ لوگ حج وعمرہ کرتے ہیں، لوگوں کے لئے لنگر خانہ قائم کرتے ہیں، ور دولت کے اس حصول کو خدا کے فضل سے تصور کرتے ہیں۔ لہٰذا اکثر کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے پاکستان ایک جنت ہے۔ معاشرہ ان نودولتیوں کے مقابلہ میں ان لوگوں کی عزت نہیں کرتا کہ جو پاک وصاف زندگی گزار رہے ہیں۔ اب تو ان کے گھر والے بھی انہیں طعنے دیتے ہیں کہ انہوں نے ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ نوجوانوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے والدین ان کے لئے جائیدادیں اور دولت کے انبار چھوڑ کر جائیں تا کہ انہیں محنت نہیں کرنی پڑے۔

لہٰذا ان دولت مند خاندانوں میں تعلیم کا حصول محض واجبی رہ جاتا ہے۔ ان کی دولت میں حصہ بٹورنے کے لئے پرائیویٹ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوگئی ہیں جہاں انہیں دولت کی بنیاد پر سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں بھی مل جاتی ہیں۔

میں نے جب اسکول، کالج، اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، تو اس وقت داخلہ، گرمیوں کی چھٹیاں، اور امتحانوں کی تاریخیں مقرر تھیں، یکم مئی سے 16 جولائی تک گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ مارچ، اپریل میں امتحانات، داخلہ کی تاریخوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔

ہمارے پرنسپل مرزا عابد عباس ایک واقعہ سناتے تھے کہ تقسیم سے پہلے ان کے کالج کا ایک طالب علم داخلہ کی تاریخ گزرنے کے ایک دن بعد آیا، اور پرنسپل سے درخواست کی کہ اسے گھر سے آنے میں دیر ہوئی ہے۔ پرنسپل نے کہا کہ تمہاری دیر سے آنے کی وجہ درست ہے مگر چونکہ تاریخ گزر گئی ہے میں داخلہ نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد اس نے کہا، ''تم ایک سال تو کھو دو گے، مگر اس کے بعد زندگی میں کئی سال بچاؤ گے۔''

نہ ہی اس وقت سپلیمنٹری اور کمپارٹمنٹ کا رواج تھا۔ اگر کوئی ایک مضمون میں بھی فیل ہو جاتا تھا تو اسے دوبارہ تمام مضامین میں امتحان دینا ہوتا تھا۔ ہمارے ایک دوست جن کا نام آزاد تھا، ادیب کے امتحان میں مسلسل چھ یا سات بار فیل ہوئے۔ اس پر کسی نے کہا کہ شاید اگر کوئی دس سال مسلسل امتحان دیتا رہے تو یونیورسٹی اسے اعزازی سرٹیفکیٹ دے دیتی ہے۔

اسی طرح سے ٹیوشن کا کوئی رواج نہیں تھا اگر کوئی طالب علم ٹیوشن پڑھتا تھا تو اسے غبی اور کُند ذہن سمجھا جاتا تھا۔ اب دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی ہے، اور تعلیم کے ہر پہلو میں تبدیلی آ گئی ہے۔ تبدیلی یقیناً ایک لازمی چیز ہے۔ دنیا ایک جگہ ساکت اور ٹھہری ہوئی نہیں رہتی ہے، مگر

تبدیلی، مثبت کے بجائے منفی ہو تو یہ معاشرے کے لئے پس ماندگی کا باعث ہوتی ہے۔ کالج اور یونیورسٹی میں یونین کے الیکشن، طلباء میں جمہوری روایات کو پیدا کرتے تھے۔ الیکشن میں خوب ہنگامہ رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم اپنا اخبار نکالتے تھے، جس میں امیدواروں کے بارے میں خبریں ہوتی تھیں، تقریریں ہوتی تھیں، الیکشن کے بعد یونین کی سرگرمیاں ہوتی تھیں جن میں آل پاکستان مباحثے، مشاعرے، موسیقی کی محفلیں، اور تھیٹر کے مقابلے منعقد کرائے جاتے تھے۔

اس وقت گورنمنٹ اور نجی تعلیمی ادارے ہوتے تھے، مگر نجی اداروں میں فیس بہت کم ہوتی تھی۔ مشنری اسکول میں داخلہ کے لئے بھی امراء طبقہ سے ہونا ضروری نہیں تھا۔ مگر تمام تعلیمی اداروں میں پڑھائی کا معیار تھا، اور جب اسکول سے کالج اور یونیورسٹی میں آتے تو یہاں سب ایک ہو جاتے تھے۔ آج کی طرح نہیں کہ امراء کے بچوں کے لئے اسکول، کالج اور یونیورسٹی بھی مکمل طور پر علیحدہ ہوگئی ہے۔ اب طبقاتی فرق ایسا قائم ہوتا ہے کہ جو آخر وقت تک رہتا ہے۔ مزید یہ کہ میڈیم نے بھی اس فرق کو پیدا کیا ہے۔ میرے وقت میں کالج اور یونیورسٹی میں انگریزی میڈیم ہوتا تھا۔ لہٰذا اس میڈیم سے پڑھ کر نکلنے والے برابر کے ہوتے تھے۔ اب انگریزی، اردو، اور سندھی میڈیم نے طبقاتی فرق کو ابھار دیا ہے۔ اگر طالب علم انگریزی میں کمزور ہے تو اس کے لئے اعلیٰ تعلیم، اور اچھی ملازمتوں کے دروازے بند ہیں۔

معاشرے میں استاد کی عزت ضرور تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ پابندی سے کلاس میں آتے تھے مگر ٹیوشن نہیں پڑھاتے تھے۔ طالب علموں سے کسی قسم کا تحفہ قبول نہیں کرتے تھے۔ امتحان میں سختی سے پرچے دیکھتے تھے۔ ہمیں کالج اور یونیورسٹی میں جانے کے بعد پتہ نہیں ہوتا تھا کہ امتحان کے پرچے کس کے پاس ہیں۔ ایم۔ اے کے پرچے سابق مشرقی پاکستان کی یونیورسٹیوں کو بھی جانچ کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ میرے استاد ڈاکٹر احمد بشیر کہا کرتے تھے کہ اگر کسی طالب علم کو 60 فیصد نمبر دینا ہوتا تھا تو میں پرچہ دوبارہ پڑھتا تھا۔ اس وجہ سے سندھ یونیورسٹی میں فرسٹ ڈویژن میں کوئی مشکل سے پاس ہوتا تھا۔ گڈ سیکنڈ ڈویژن قابلیت کی اچھی ڈگری تھی۔

لیکن اعلیٰ تعلیم کا وہ معیار نہیں تھا کہ جو غیر ملکی یونیورسٹیوں کا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ تقسیم کے بعد یہاں سے ہندو، سکھ اور اکثر عیسائی پروفیسران چلے گئے تھے۔ ہندوستان سے آنے والوں میں کوئی بہت زیادہ قابلیت کے لوگ نہیں تھے۔ اس لئے جب میں اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر گیا

تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو کچھ نہیں آتا ہے۔ ہمیں ریسرچ مقالہ لکھنے کی کوئی تربیت نہیں تھی، نہ یہ معلوم تھا کہ حوالہ جات کیسے دیئے جاتے ہیں، نہ کتابیات کی تیاری کے بارے میں کچھ علم تھا۔ جب کہ وہاں کے طالب علم ان سب میں ماہر تھے۔ اس لئے وہاں سخت محنت کرنی پڑی۔

اب اس وقت کے نصاب کو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس قدر فرسودہ تھا۔ بدقسمتی سے یہ فرسودگی اب اور زیادہ ہوگئی ہے۔ تاریخ کا نصاب وہی بیانیہ تاریخ، جو شاہی خاندانوں کی تھی، پڑھائی جاتی تھی۔ تاریخ کے مضمون میں جو تبدیلیاں آ گئیں تھیں، کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ اس وقت کا حال ہے کہ جب اساتذہ آج کے مقابلہ میں زیادہ پڑھتے تھے اور پڑھاتے تھے۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سفارشی، اور رشتہ داروں کی تقرری ہونے لگی۔ جب 1989ء میں، میں نے یونیورسٹی چھوڑی ہے تو یہاں ایسے استاد آ چکے تھے کہ جو اسکول میں پڑھانے کے لائق نہیں تھے۔ ایک زمانہ میں لوگوں کو شوق تھا کہ دو چار ایم۔ اے کرتے تھے، چونکہ امتحان پاس کرنا مشکل نہیں رہا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں بھی اسی طرح سے سستی ہوگئیں۔ کچھ مضامین تو ایسے تھے کہ جہاں پی۔ ایچ۔ ڈی کی فیکٹریاں کھلی ہوئی تھیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے نگران حضرات کے دوسری یونیورسٹیوں کے پروفیسروں سے تعلقات تھے اور یہ ایک دوسرے کے امیدوار کو پاس کرتے تھے۔ جرمنی کی یونیورسٹیوں کی ایک شرط ہے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں پاس ہونے والے امیدوار کو اپنا تھیس شائع کرنا پڑتا ہے اس کے بغیر اسے ڈگری نہیں ملتی ہے۔ اگر یہی شرط پاکستان میں عائد ہو جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ کتنے تھیس پی۔ ایچ۔ ڈی کے قابل ہیں۔

پی۔ ایچ۔ ڈی کے سلسلہ میں بہت سے اسکینڈل سامنے آئے، مثلاً کراچی یونیورسٹی میں اردو میں کسی پروفیسر نے چار یا پانچ سال پرانے تھیس کو دوبارہ اپنے نام سے پیش کر دیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کے ممتحن بھی وہ ہی لوگ تھے جو اس سے پہلے اسے اس پر ڈگری دے چکے تھے۔ ان صاحب کو بھی ڈگری مل گئی، بعد میں یہ راز کھلا اور اسے یونیورسٹی کی بدنامی کہہ کر دبا دیا گیا۔ لیکن اس سے یہ ضرور ہوا کہ نہ تو ممتحن حضرات تھیس پڑھتے ہیں، اور نہ لکھنے والا اس پر محنت کرتا ہے۔ مشرف کے زمانے میں ہائر ایجوکیشن کمیشن بنایا گیا تھا جس کا مقصد یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو معیاری بنایا جائے اور زیادہ سے زیادہ پی۔ ایچ۔ ڈیز پیدا کئے جائیں۔ پتہ نہیں جن ماہرین نے یہ مشورہ دیا اور

دلائی لامہ سے ایوارڈ لیتے ہوئے

گوئٹے انسٹیٹیوٹ کراچی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیرر کے ساتھ

حمزہ علوی کے ساتھ

نرملا دیش پانڈے کے ساتھ

نوید علی خاں (بھتیجا) جو میری کتابیں شوق سے پڑھتا ہے

ملک، معاشرہ اور عوام کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔

انسان کو زندگی مختصر ہی لگتی ہے، بچپن اور جوانی میں تو احساس نہیں ہوتا ہے مگر جب ساٹھ سال سے زیادہ عمر ہو جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ جوانی اس قدر تیزی سے کہاں گم ہو گئی۔ میں نے اب تک کئی دنیاؤں کو دیکھا ہے۔ ہندوستان میں گیارہ سال کا عرصہ، اس کے بعد سندھ میں قیام، چھ سال کے لئے انگلستان اور جرمنی میں رہنے کا تجربہ۔ پاکستان میں جمہوریت اور فوجی آمریت کے دور بھی دیکھے۔ ایک طبقاتی معاشرے میں رہنے کا تجربہ بھی ہوا۔ اگر آپ کا تعلق عام لوگوں سے ہے یا متوسط طبقے سے تو اس معاشرے میں ان کے لئے عزت اور وقار کی جگہ نہیں۔

میں نے اخلاقی قدروں کو پامال ہوتے دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ ایمانداری اور دیانت کس طرح سے پشیمانی کا باعث بن جاتی ہیں، اور کس طرح ایک حساس شخص کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے اس وقت کہ جب مذہبی انتہا پسندی عروج پر ہو، تو لبرل خیالات رکھنے والا بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ ریاست اور حکومت سے تو لڑ سکتے ہیں، لیکن اگر معاشرہ اس کا شکار ہو، تو ان سے لڑنا اور ان کے درمیان زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ سبھی میرے سامنے کی باتیں ہیں کہ سیاست کس طرح سے دولت کمانے کا ذریعہ بنی، اور یہ بھی کہ طبقہ اعلیٰ کے لوگ قانون سے بالاتر ہو گئے۔ اگر چہ بابر بادشاہ نے کہا ہے کہ

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

یہ بابر کے لئے تو ٹھیک تھا کہ وہ حکمراں رہا، اس کے پاس عیش و عشرت کے ذرائع تھے مگر ان لوگوں کے لئے یہ کس قدر اذیت ناک ہے کہ جو جانتے ہیں کہ یہ دنیا بار بار نہیں آئے گی اور وہ محرومیوں اور مایوسیوں کے عالم میں اس جہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ایک بار ایک یونانی مفکر نے لوگوں سے پوچھا کہ بتاؤ، خدا کی سب سے بڑی نعمت کیا ہے جو اس نے انسان کو دی ہے؟

اس پر لوگوں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا۔ کسی۔ نے کہا کہ خدا نے خوبصورت فطرت تخلیق کی ہے تا کہ لوگ اس کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوں۔ کسی نے کہا کہ یہ ذائقہ دار غذا، خوبصورت لباس، اور دلکش محبوبہ سب سے بڑی نعمتیں ہیں۔ جب اس نے سب کی بات

سن لی تو بولا، بیوقوفو! خدا کی سب سے بڑی نعمت انسان کے لئے یہ ہے کہ اسے دوبارہ پیدا نہیں کیا جائے گا۔

نتشے کہا کرتا تھا کہ زندگی دکھ اور اذیت کا نام ہے۔ جس طرف نظر ڈالو انسان تکلیف میں مبتلا نظر آتا ہے، یا کسی اور مفکر کے مطابق انسان روایات اور اقدار کی زنجیروں میں قید ہے۔ وہ بغاوت کرتا ہے ان زنجیروں کو توڑتا ہے، اور دوبارہ اپنی ہی بنائی ہوئی نئی روایات اور قدروں کا اسیر ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزادی اس کے مقدر میں نہیں۔

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

یونانی ڈرامہ نگار سوفوکلس (Sophocles) نے اپنے ایک ڈرامہ میں لکھا ہے کہ

Call no man happy untill he dies.

یعنی کسی کو اس وقت تک کامیاب اور پُر مسرت وخوشی کی زندگی گزارنے والا نہ کہو جب تک کہ وہ مر نہ جائے۔ یونان کا مشہور قانون دان سولن (Solan) لیڈیا کے بادشاہ قارون کے پاس گیا۔ یہ وہی قارون ہے کہ جس کی دولت اور خزانوں کے بارے میں قصے مشہور ہیں۔ قارون نے سولن سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک اس دنیا کا خوش قسمت انسان کون ہے؟ اس کا خیال تھا کہ سولن یقیناً اس کا نام لے گا، کیونکہ اس کے پاس بے انتہا دولت تھی اور وہ عیش وعشرت کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس پر سولن نے ایتھنز کے ایک شخص کا نام لیا کہ جو اپنے ملک کے دفاع کی خاطر لڑتا ہوا مارا گیا، شہر کے لوگوں نے اس کی تجہیز وتکفین ریاست کے خرچہ پر کی۔ سولن نے کہا وہ شخص خوش قسمت تھا کہ مرتے وقت تک اس کو کسی حادثہ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

قارون نے پوچھا کہ دوسرا خوش قسمت کون ہے؟ اس پر سولن نے کہا کہ یہ دو بھائی ہیں کہ جو اپنی ماں کو ہیرا کے مندر لے کر گئے۔ کیونکہ اس کی رتھ یا گاڑی کے لئے بیل نہیں تھے اس لئے دونوں بھائیوں نے ان کی جگہ گاڑی کو کھینچا اور پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں سے گزار کر ماں کو ہیرا کے مندر لے گئے کہ وہ اسے نذرانہ پیش کرے۔

ماں اپنے لڑکوں کی اس اطاعت گزاری سے خوش ہوئی اور ہیرا دیوی سے دعا کی کہ اس کے لڑکے خوشی ومسرت کی زندگی گزاریں۔ جب وہ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں

لڑ کے تھک کر مندر کے فرش پر سو گئے تھے۔ اسی حالت میں دونوں مر گئے اور انہیں کسی ناکامی اور زندگی کے دکھ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

قارون کو افسوس ہوا کہ وہ کیوں خوش قسمت انسانوں میں نہیں ہے۔ قصہ آگے بڑھتا ہے کہ قارون نے ڈیلفی کے مندر میں جا کر پوچھا کہ اگر وہ ایران سے جنگ کرے گا تو کیا اس میں اسے کامیابی ہوگی؟ اس پر جواب دیا گیا کہ دو میں سے ایک امپائر کا خاتمہ ہو جائے گا۔ قارون نے اس سے یہ مطلب لیا کہ وہ ایران کی سلطنت کا خاتمہ کر دے گا مگر جنگ ہوئی تو اسے شکست ہوئی اور اس کی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

ایران کے بادشاہ نے حکم دیا کہ قارون کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ جب اسے جلانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو اسے سولن کی بات یاد آئی اور وہ ہنس پڑا۔ بادشاہ نے جب اس کی ہنسی کی وجہ پوچھی تو اس نے سولن کا واقعہ سنایا۔ اس پر شاہ ایران نے اسے معاف کر دیا۔

انسان اپنی مختصر زندگی میں خوشی و مسرت اور دکھ دونوں سے گزرتا ہے وہ کامیاب بھی ہوتا ہے اور ناکام بھی۔ اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کیا اس کی زندگی بامقصد گزری یا بے مقصد۔ ایسے بہت سے افراد ہیں کہ جو زندگی بھر تحقیق اور جستجو میں رہتے ہیں، علم حاصل کرتے ہیں، ذہنی ترقی کرتے ہیں، مگر اس ورثہ کو چھوڑنے کے بجائے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو دولت اکٹھی کرتے ہیں اور اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں، کچھ عسرت اور مفلسی کی، ان میں سے کون خوش قسمت ہے کہ آخر وقت تک اذیت و دکھ سے دور رہا، اور مرتے وقت تک پُر مسرت لمحات کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوا۔

عام طور سے لوگ اپنے زمانہ یا عہد سے مطمئن نہیں ہوتے ہیں۔ اکثر لکھنے والے جب اپنے دور کے بارے میں لکھتے ہیں تو ان کے ہاں ایک نوحہ اور ماتم ہوتا ہے، دوستوں کی بے وفائی، رشتہ داروں کی سرد مہری، اور لوگوں کی بے اعتنائی، سماج کا الٹ پلٹ ہونا کہ جس میں امیر غریب اور غریب امیر ہو گئے، معاشرے کی قدریں بدل گئیں، اور لکھنے والا ان سب کو بے بسی کے ساتھ دیکھ رہا اور محسوس کر رہا ہے۔

اس لئے جب میں اپنے دور کے بارے میں لکھنے کا سوچتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید

دنیا نہیں بدلی ہے، وہی قدریں ہیں، وہی حالات ہیں کہ جن کا شکوہ پچھلے لکھنے والے کرتے چلے آئے ہیں۔ میرے لئے میرا اپنا ماحول اجنبیت کا ہو گیا ہے، کوئی وقت کی پابندی نہیں کرتا ہے، وعدے کا پاس کسی کو نہیں ہے، دھوکہ، فریب اور جھوٹ زندگی میں کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ اخلاقی قدریں ختم ہو چکی ہیں، طاقت ور کمزور کو کھا رہا ہے۔ معاشرہ انتشار، بے چینی اور افراتفری کا شکار ہے۔ اس کی وجوہات کو سمجھنے کے لئے میں نے ''پاکستانی معاشرہ'' ایک مختصر سی کتاب لکھی ہے، اس میں ان کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن میں اپنے اردگرد کی اس دنیا میں روز بروز اجنبی ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ دانشوروں کی باتوں میں انتہائی سطحیت آ گئی ہے، علمی گفتگو کرنا اور اس کے معنی دوسروں تک پہنچانا ناممکن ہو گیا ہے۔ اکثر محفلوں میں جب بحث ہوتی ہے کہ آخر ہم کیوں پس ماندہ ہیں، تو اس کے دو جوابات ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ انگریز اس ملک کو چھوڑ کر چلے گئے، اس لئے ہم میں اتنی صلاحیت اور لیاقت نہیں ہے کہ اس ملک کو چلا سکیں۔ انگریزوں نے ہمیں مہذب بنانے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ انگریزی دور کو یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں، اور پنی آزادی پر ماتم کرتے ہیں۔ دوسری وجہ پس ماندگی کی یہ بتائی جاتی ہے کہ دراصل ہماری قوم میں خرابی کی وجہ جین کی خرابی ہے، اس کا علاج ممکن نہیں، اس لئے پس ماندگی اسی طرح رہے گی۔

ان دونوں وجوہات کو بیان کر کے ہمارے دانشور ہر قسم کے فرض سے چھٹکارا پا لیتے ہیں کیونکہ معاشرے کی اصلاح ناممکن ہے، اس لئے اپنی زندگی کو ہر ممکن طریقے سے خوشگوار بناؤ علم فروخت کر کے، ضمیر بیچ کر، اور سمجھوتہ کر کے، قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس سطحیت اور بے ضمیری کی دنیا میں سوچنا، غور کرنا اور نئی بات لکھنا سب فضول ہو جاتا ہے۔

سطحیت کی اس سوچ میں ہمارے تعلیمی نظام کا بھی حصہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میری طالب علمی کے زمانہ میں ذہین طلباء فلسفہ، ادب، تاریخ اور دوسرے سماجی علوم پڑھتے تھے، نالائق لوگ سائنس کی طرف جاتے تھے۔ سماجی علوم کی تعلیم سے کم از کم پڑھنے والوں میں سوچ اور فکر کے دروازے کھلتے تھے، بحث میں ذرا گہرائی ہوتی تھی، مگر جب سے سائنس اور ٹیکنالوجی، یعنی آئی۔ٹی وغیرہ مقبول ہوئے ہیں یہ طالب علموں کو روبوٹ بنا رہے ہیں، ان میں اپنے ماحول اور اردگرد کی دنیا کو سمجھنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے ___ ان کی معلومات کا واحد ذریعہ ٹی۔وی چینلز

ہیں۔ کتابیں پڑھنے کا شوق آہستہ آہستہ ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ ہے کہ نئے خیالات کے دروازے بند ہو گئے ہیں، اور سوچ کی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔

جب دنیا بدلتی ہے تو پرانی دنیا آہستہ آہستہ نئی کے لئے راستہ دیتی ہے، اور خود پیچھے کی جانب جاتی رہتی ہے، یہاں تک کہ پرانی دنیا غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ شہر وہی رہتے ہیں، اکثر عمارتیں بھی وہی رہتی ہیں مگر مکین بدل جاتے ہیں۔ عمارتیں اپنے مالکوں سے زیادہ عمر پاتی ہیں، اور آہستہ آہستہ خستہ ہو کر گرتی ہیں، مگر ہمارے ہاں شہر بھی تیزی سے بدل گئے۔ پرانی عمارتوں کو گرا کر ان کی جگہ نئے پلازہ تعمیر ہو گئے، اس کی وجہ سے شہر کا ماضی بھی روپوش ہو گیا، اور شہر اپنی تاریخ کو بھول گیا۔ یورپ میں لندن، پیرس اور ویانا اپنے تاریخی کردار کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ تاریخ کا شعور نہیں، اس لئے شہروں کی تاریخ کو بھی مسخ کر کے اسے مٹا دیا گیا۔ اس کا ماضی سے رشتہ توڑ دیا گیا، اور ایک نیا شہر، ایک نئی دنیا میں آباد ہو گیا۔

حیدرآباد شہر جہاں میں نے اپنا بچپن اور جوانی گذاری، اب وہ شہر نہیں کہ جو میں نے دیکھا تھا، صاف ستھرا، خوبصورت، باغوں اور کتب خانوں والا شہر، شام کی ٹھنڈی ہوائیں، اور سکون و خاموشی والا شہر، جب ہم پہلی مرتبہ 1952ء میں آئے تو دیکھا کہ شہر کے ہر مکان پر ہوادان بنے ہوئے ہیں، مغرب سے آنے والی ہوائیں، ان کے ذریعہ کمروں کو ٹھنڈا رکھتی تھیں، مکانوں میں پنکھوں کی ضرورت نہیں تھی، دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہوادان غائب ہونے لگے اور ان کی جگہ سیمنٹ اور کنکریٹ کے مکانات تعمیر ہونے لگے۔ اب یہ ہوادان جو کبھی اس شہر کی شناخت تھے، بالکل نظر نہیں آتے۔

اس بار جب میں حیدرآباد گیا تو سوچا کہ ذرا پیدل چل کر شہر اور اس کی نئی دنیا کو دیکھوں۔ میرے زمانہ میں شہر میں صرف تانگے چلا کرتے تھے، سڑکیں صاف ستھری اور خالی ہوتی تھیں، کاریں شہر میں دو یا چار ہوں گی، لہٰذا سڑک کے بیچ میں بھی بغیر کسی خوف کے چلا جا سکتا تھا۔ مگر اب یہ ناممکن ہے، رکشہ، موٹریں، اسکوٹریں، ٹرک اور بسوں کا شور وغل، پیدل چلنا مشکل ہو گیا ہے۔ جب میں ہیرآباد میں داخل ہوا، تو معلوم ہوا کہ کسی اور محلّہ میں آ گیا ہوں۔ عامل کالونی کے وہ پائین باغ جو ہر مکان کے ساتھ تھے، اب غائب ہو چکے ہیں جگہ جگہ مکانوں میں نئی تعمیرات

ہوگئیں ہیں۔ مکانوں کے تہہ خانے جو سڑک کی جانب ہوتے تھے، ان میں مستریوں کی دوکانیں کھل گئیں ہیں، اس قدر نئی تعمیرات کہ پرانی گلیوں کو ڈھونڈ نا مشکل ہو گیا۔ اب یہاں کوئی جاننے والا نہیں رہا، اکثر دوست کراچی جا چکے، ہر طرف نئے چہرے اور نئے لوگ۔

ہیرا آباد سے ہوتا ہوا، جب مارکیٹ ٹاور کی طرف آیا، تو نور محمد ہائی اسکول کی جانب مڑ گیا۔ یہ اسکول اب دکانوں میں گھرا ہوا ہے، اس کے آگے ایلائٹ (اے لٹ) سنیما تھا، جو اب ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ نیا پلازہ بن گیا ہے۔ وہاں سے تلک چاڑی کی جانب جاتے ہوئے، کونے پر پان کی دکان تھی جو اب بھی ہے، مگر مین سڑک پر ایجوکیشن بک ڈپو نہیں رہا، ایک زمانہ میں ان کے پاس ہندوستان اور باہر کی نئی کتابیں آتی تھیں۔ آگے چل کر فوٹو گرافر کی دکان تھی، جو اب نہیں ہے، کیفے شیراز بھی ختم ہو چکا ہے۔ تلک چاڑی اب بالکل بدل گیا ہے دکانوں کی بھرمار، ٹریفک کا شور، کیفے یونٹی بھی کبھی کا بند ہو گیا ہے۔

تلک چاڑی سے نیچے اتر کر آئیں تو سینٹ میری اور سینٹ بوناوینچر اسکول ہیں، اب یہاں سے پیدل چل کر آگے جانا، ناممکن ہے، رسالہ روڈ پر کونے پر کیفے جارج تھا وہ بھی بند ہو گیا ہے۔ صدر میں ایک گلی جو کینٹ کی جانب جاتی ہے، وہاں اب ڈاکٹرز کی کلینکس ہیں، ہوٹل رٹز بھی ختم ہو گیا ہے اور اب یہاں اس قدر دکانیں اور ٹریفک ہوتا ہے کہ چلنا مشکل ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں سے ٹھنڈی سڑک رانی باغ تک جاتی تھی، اب نہ سڑک رہی اور نہ ٹھنڈی رہی۔

ایک دن اپنے پرانے کالج، سٹی کالج کو دیکھنے گیا، وہ بھی دکانوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی عمارت خستہ اور شکستہ ہوگئی ہے، کالج کا ماحول انتہائی افسردہ کرنے والا ہے۔ حیدرآباد جو کبھی سکون کی جگہ تھی، وہاں اب ہر طرف پلازہ اور دکانیں بن گئی ہیں، درخت اور سبزہ بالکل غائب ہو گیا ہے۔

جب شہر بے ہنگم اور بے ڈھب ہو جاتے ہیں تو اس کے مکین بھی ایسے ہی ہو جاتے ہیں، آبادی کے باوجود ویرانی نظر آتی ہے۔ زندگی میں بے مقصدیت گھر کر لیتی ہے، شکوہ و شکایت اور ماتم کے سوائے اور کچھ نہیں رہتا ہے۔ پاکستان میں نہ صرف حیدرآباد بدلا ہے، بلکہ ہر شہر اپنی شناخت کھو کر نئی شکل میں ابھرا ہے، یہ نیا قالب انتشار اور بے یقینی کا ہے جو اس شہر کے باشندوں کو قرار نہیں دیتا ہے، اس سے لگاؤ اور محبت پیدا نہیں ہوتی ہے،

بلکہ اس سے بیزاری ہوتی ہے۔

میں لاہور میں 1989ء سے ہوں، اس عرصہ میں شہر لاہور میرے دیکھتے ہی دیکھتے بدل گیا ہے، ایک طویل عرصہ گزارنے کے باوجود میں اب تک اس شہر میں اجنبی ہی ہوں، اور لاہور والے بھی مجھے غیر سمجھتے ہیں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اب دوسرا شہر آباد کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں کسی دن فیصلہ کرلوں، اور یہاں سے رخصت ہو جاؤں، اور کسی اور دنیا کو آباد کرنے کی کوشش کروں۔

ملازمتیں

ملازمت کرنا ایسا ہی ہے جیسے غلامی کی زندگی گزارنا اور بسر کرنا۔ جب آپ کسی کے ملازم ہوجاتے ہیں تو آپ کا آقا اور مالک یہ سمجھتا ہے کہ اب مکمل طور پر اس کے قبضے میں ہیں۔ ایک ملازم کو وہی کرنا ہے، جو اس کا سربراہ اس سے کہتا ہے۔ اسے اس کی آزادی نہیں ہوتی کہ وہ اس کے احکامات میں کمی وبیشی کر سکے۔ اس کی شخصیت ختم ہوجاتی ہے اور آقا یا مالک کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ اب اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس کی ہر بات پر آمنا وصدقنا کہے اور اس کی خوشنودی کی خاطر اپنی خواہشات کو قربان کردے۔ ایسے ملازم وفادار اور اچھے کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

اگر کوئی ملازم آقا، مالک، یا سربراہ کے احکامات کی حکم عدولی کرتا ہے تو اسے فوراً ملازمت سے برخواست کردیا جاتا ہے۔ جب ایک فرد کی معیشت کے دروازے بند کردیئے جائیں، تو وہ اس ڈر اور خوف سے ہر قسم کی ذلت برداشت کرنے پر تیار رہتا ہے۔

ملازمت میں ترقی، اور استحکام کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ خوشامد کے تمام حربوں کو استعمال کیا جائے۔ اگرچہ یہ ملازم کی عزت نفس اور خودداری کو تو ختم کردیتی ہے، مگر اس کا روزگار برقرار رہتا ہے۔

میرے نزدیک ایک ملازم اور ملزم میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ دونوں ہی خوف زدہ رہتے ہیں کہ ان پر جرم عائد کر کے مجرم نہ بنادیا جائے۔

جن معاشروں میں ذرا ترقی ہوئی ہے اور مراعات یافتہ وغیر مراعات یافتہ طبقوں میں فرق ہوا ہے، وہاں ملازموں کو قابو میں رکھنے کے لئے قوانین وضوابط بن جاتے ہیں۔ یہ قوانین ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں تمام اختیارات سربراہ کو ہوتے ہیں، ملازم کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس کے احکامات کو پوری طرح سے بجالائے۔

ریاست سربراہ اور عام ملازمین کے لئے باقاعدہ ضوابط بناتی ہے۔ اس بیوروکریسی میں اختیارات کی تقسیم ہوتی ہے۔ یہ ایک اہرام کی مانند ہے کہ جس میں چوٹی پر اعلیٰ افسر ہوتا ہے، پھر اس کے ماتحت، درجہ بدرجہ نیچے کی جانب آتے رہتے ہیں۔ قوانین وضوابط کی یہ گرفت اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ کوئی ملازم اپنے دائرہ سے باہر قدم نہیں نکال سکتا ہے۔ لہٰذا ملازمت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی آزادی، اور اظہار رائے کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی اس گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے در بدر کی ٹھوکریں کھانا ہوتی ہیں اور وہ عبرت کا ایسا نمونہ بن جاتا ہے کہ لوگ اس سے سبق حاصل کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ان کی ملازمت باقی ہے اور وہ اپنے خاندان کی کفالت کرر ہے ہیں۔

میری ملازمتوں کی ابتداء تب ہوئی کہ جب میں صرف میٹرک پاس تھا۔ جب ایسا سرٹیفکیٹ رکھنے والے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہوں تو پھر ملازمت کا دارومدار سفارش اور رشوت پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی اعلیٰ ڈگری رکھتا ہو، اور یہ ڈگری باہر کے کسی ملک سے حاصل کی ہو تو، اس صورت میں اس کی عزت کی تھوڑی جگہ نکل آتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی پروفیشنل ہو، اکاؤنٹ میں ماہر ہو یا آئی۔ٹی کا سند یافتہ ہو تو اس کی مہارت کی وجہ سے وہ عزت کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے جب میں نے ایک پرائمری اسکول میں ملازمت کی اور ذرا اس میں ہونے والی بدعنوانیوں کی نشان دہی کی تو میرے لئے اس اسکول میں کوئی جگہ نہیں رہی۔ اس کے بعد میں نے ہائی اسکول اور کالج میں پڑھایا، اور ہمیشہ ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل سے خوف زدہ رہا کہ نہ جانے کب نکال دیں، اور ہوا بھی یہی کہ ایک دن خط ملا کہ آپ کو ملازمت سے برخواست کیا جاتا ہے۔

سندھ یونیورسٹی میں، جب میں لیکچرر ہوا تو یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میرے استاد ڈاکٹر احمد بشیر روایتی سربراہ شعبہ نہیں تھے، جیسا کہ دوسرے شعبوں میں ان کے سربراہ تھے جو اپنے اساتذہ پر سخت نظر رکھتے تھے۔ اس ملازمت میں میں بالکل آزاد تھا۔ ڈاکٹر بشیر صاحب کا کہنا تھا کہ استاد کی حاضری، اس کا کلاس لینا ہے اس وقت تک حاضری کا کوئی رجسٹر نہیں ہوتا تھا۔ کلاسیں پڑھانے کے بعد میں آزاد تھا کہ یونیورسٹی میں رہوں، یا گھر جاؤں۔ کیونکہ دیکھا جائے تو یہ ملازمت 24 گھنٹے کی تھی۔ کلاس کی تیاری کے لئے کئی کئی گھنٹے تیاری کرنی ہوتی تھی۔ اس لئے میں نے اس ملازمت کو مسرت وخوشی سے بھرپور پایا۔

جب میں جرمنی سے ڈگری لے کر آیا تو یونیورسٹی کے حالات بدل چکے تھے۔ دیکھا کہ شعبہ میں حاضری کا رجسٹر رکھا ہوا ہے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ کو خیال تھا کہ اس طرح سے وہ اساتذہ کو پابند کر دیں گے، مگر ہوتا یہ تھا کہ جو لوگ دو، دو، تین، تین دن نہیں آتے تھے وہ یا تو آ کر حاضری لگا دیتے تھے، یا پہلے سے لگا کر چلے جاتے تھے۔ رہے سربراہ تو ان کا بھی یہی وطیرہ تھا۔ ایسے میں اگر کوئی سربراہ پوچھ گچھ کرے تو شعبہ کے تمام اساتذہ اس کے خلاف ہو جاتے تھے۔ یہ سلسلہ بڑے عرصہ چلا، اس کی خبر وائس چانسلر اور انتظامیہ کو ہوئی تھی، لہٰذا اس کو روکنے کے لئے دوسرا حکم نامہ آیا کہ صبح حاضری کے بعد تمام رجسٹر وائس چانسلر کے آفس بھیجے جائیں۔ لیکن انسانی ذہن میں بڑی اختراع ہے، یار لوگوں نے یہ کیا کہ صبح آئے، حاضری لگائی اور پھر غائب۔ اس کا کیا حل ہو___ تیسرا حکم نامہ آیا کہ حاضری صبح اور جاتے وقت لگائی جائے اور یہ بھی کہ آخر میں حاضری کے رجسٹرز وائس چانسلر کے آفس بھیجے جائیں۔ لہٰذا حاضری کے رجسٹروں کی لیفٹ رائٹ لگ گئی۔ مگر جب خرابی پیدا ہو جائے، لوگوں کو اپنے پیشہ سے لگاؤ نہ رہے تو یہ پابندیاں انہیں اچھا ملازم نہیں بنا سکتی ہیں۔ کیونکہ اکثر اساتذہ نے یا تو ٹیوشن سنٹرز کھول لئے تھے، یا کوئی دوسرے کاروبار میں مصروف تھے۔ یونیورسٹی کی ملازمت شاید معاشرہ میں سماجی مرتبہ حاصل کرنے کے لئے تھی۔ مگر جب اساتذہ اپنے فرض سے غافل ہو جائیں تو پھر یہ پیشہ قابل عزت نہیں رہتا ہے۔ ان میں اور دفتروں کے کلرکوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کا جو عزت و وقار تھا، وہ جاتا رہا۔

گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور میں میری ملازمت کی ابتداء بہت اچھی تھی۔ یہاں میری تقرری میں کراچی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیرر کا حصہ تھا۔ لاہور میں ڈائریکٹر کی جگہ خالی تھی، جرمن حکومت مالی مشکلات کے تحت کسی جرمن کو یہاں بھیجنے پر تیار نہیں تھے۔ شیرر نے یہ تجویز دی کہ کسی پاکستانی کو اگر ڈائریکٹر مقرر کر دیا جائے تو یہ سستا بھی رہے گا اور وہ گوئٹے کے پروگراموں میں مدد کر سکے گا۔ میری اس سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ''آمریت اور معاشرہ'' پر ایک سیمینار کرا رہے تھے، جب اسے پتہ چلا کہ میں نے جرمن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے تو اس کے ذہن میں میرا نام آیا، اور اس نے کوشش کر کے مجھے لاہور کا ڈائریکٹر مقرر کرا دیا۔

ڈاکٹر شیرر سے دوستی تھی، خوشگوار تعلقات تھے، اس لئے جب تک وہ ڈائریکٹر رہا، میرے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا، ہم نے مل کر بہت کامیاب کانفرنسیں منعقد کرائیں۔ جس کی وجہ سے

لاہور اور کراچی میں انسٹی ٹیوٹ بڑا مقبول ہو گیا۔

جب ڈاکٹر شیرر کا تبادلہ ہوا، اور اس کی جگہ نیا ڈائریکٹر مارٹن ویلڈے آیا، تو ابتداء میں تعلقات ٹھیک تھے۔ مگر ویلڈے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ میں اسے اپنا بوس تسلیم کروں، اور برابر کے تعلقات سے پرہیز کروں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ہمارے تعلقات خراب ہوتے چلے گئے۔ جرمن بیوروکریسی میں بوس، اور اس کے نیچے ماتحت عملہ میں فرق ہوتا ہے۔ بات یہاں تک پہنچی کہ مجھے ملازمت سے برخواست کر دیا گیا۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد لاہور کا انسٹی ٹیوٹ بھی بند ہو گیا۔

ابھی میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی ملازمت میں تھا، مگر اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے یہ چھوڑنا پڑے گی۔ اس لئے دوسری ملازمت کی تلاش تھی کہ اخبارات میں اشتہار آیا کہ حکومت پاکستان کی جانب سے پاکستان اسٹڈی چیرز جو دوسرے ملکوں میں قائم ہیں، ان میں سے ایک ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں بھی ہے۔ وہاں حکومت کسی کا تقرر چاہتی تھی۔ اس پر میں نے درخواست دی، یہ میری غلط فہمی تھی کہ میں نے سوچا کہ اس عہدے کے لئے مجھ سے زیادہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ میں جرمن یونیورسٹی کا پی۔ ایچ۔ ڈی ہوں، جرمن زبان آتی ہے، تدریس کا تجربہ ہے، تحقیقی مضامین بھی ہیں، انٹرویو ہوا، اور ایک صاحب جن کی سفارش بہت تگڑی تھی، ان کا انتخاب ہو گیا، اور میں منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت اپنی اوقات کا احساس ہوا کہ میری اس معاشرے میں کیا حیثیت ہے۔

گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی ملازمت سے فارغ ہوا، تو آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس دوران کچھ اداروں میں سی۔ ایس۔ ایس کے کورسز پڑھائے، یہاں لیکچر کے حساب سے پیسے مل جاتے تھے۔ مگر ان سے گزارا کہاں ہوتا۔ اسی حالت میں تھا کہ عورت فاؤنڈیشن کی جانب سے یک پیش کش آئی۔ اس کی سربراہ مسز نگار احمد ہیں، انہوں نے آفس میں ملاقات کا ٹائم دیا۔ دس بجے ملنا تھا، مگر میں وہاں گیارہ یا ساڑھے گیارہ بجے تک انتظار کرتا رہا، جب وہ نہیں آئیں تو گھر چلا آیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد وہ میرے پاس گھر آئیں، انہیں پولیٹکل ایجوکیشن کے نام سے پروگرام شروع کرنا تھا۔ مجھے اس پروگرام میں بطور ڈائریکٹر پیش کش کی، جو میں نے قبول کر لی۔ اس حیثیت سے میں نے پورا ایک نصاب تیار کیا، مگر بدقسمتی سے اس نصاب پر کوئی عمل نہیں ہوا۔

نصاب کے ساتھ ساتھ لیکچرز وغیرہ کا پروگرام تھا۔ آفس میں میرے لئے ایک جگہ بنائی گئی، جہاں میں جا کر کام کرتا تھا۔ اس پروگرام کے چھ یا سات مہینے بعد مجھے ایک ہفتہ کے لئے ہندوستان میں ایک کانفرنس میں جانا ہوا، واپس آ کر دیکھا تو میری جگہ کسی خاتون کو دے دی گئی، اب میرے لئے بیٹھنے کو کوئی جگہ نہیں تھی۔ مزید یہ کہ میرے ایک ہفتہ کی تنخواہ کاٹ لی گئی۔ اس پر میں نے خاموشی سے استعفیٰ دیدیا اور یوں یہ ملازمت بھی جاتی رہی۔

عورت فاؤنڈیشن سے رخصت ہونے کے بعد، پھر بیروزگاری تھی۔ لیکن ایک مرتبہ پھر ایک پیش کش ہوئی، اس مرتبہ یہ پیش کش ایک جرمن فاؤنڈیشن کی جانب سے ہوئی، ہائنرش بول فاؤنڈیشن (Heinrich Beol Foundation) پاکستان میں اس کی نمائندہ روشن دھنجی بائی تھیں، جو رہنے والی تو کراچی کی تھیں لیکن عرصہ ہوا جرمنی میں آباد ہوگئیں تھیں اور وہیں شادی کرلی تھی۔ میں انہیں جرمنی سے جانتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ ہماری یونیورسٹی میں لیکچر دینے آئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ویت نام جنگ کے خلاف طلباء کے زبردست مظاہرے ہورہے تھے۔ ان کے لیکچر میں ہال بھرا ہوا تھا، یہ بہت اچھا بولتی تھیں، وہاں مختصر سا تعارف ہوا۔ اس کے بعد لاہور میں دو ایک میٹنگوں میں ان سے ملاقاتیں رہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی فاؤنڈیشن جس کا تعلق جرمنی کی گرین پارٹی سے ہے، وہ ایک پروجیکٹ کی ابتداء کرنا چاہتے ہیں، اس کا نام ہے، یورپین — ایشین ڈائی لاگ (European-Asian Dialogue)۔ تم اس کے کوآرڈینیٹر بن جاؤ۔ ظاہر ہے میں نے فوراً آمادگی ظاہر کردی۔ کہنے لگیں: اگر تیار ہو تو اس کی ایک میٹنگ تھائی لینڈ کے شہر چینگ مائی میں ہورہی ہے، ہمارے ساتھ چلو۔

میں اس سے پہلے 1960ء میں تھائی لینڈ اور چینگ مائی جا چکا تھا۔ یہ تجربہ بھی خوب تھا۔ ایشین کلچرل فورم کی جانب سے ایک سیمینار تھا، اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو تھائی لینڈ، اس کے شہر بنکاک اور چینگ مائی کی سیر کرلی جائے۔ اس زمانہ میں فلائٹ کراچی سے ہوتی تھی۔ پی۔ آئی۔ اے کی فلائٹ حسب معمول دیر سے چلی اور میں کوئی رات کے بارہ بجے بنکاک پہنچا۔ چینگ مائی کی فلائٹ تو کبھی کی جا چکی تھی۔ میں نے سوچا کیا کیا جائے، رات کو کہاں جایا جائے۔ اتفاق سے میرے پاس کلچرل فورم کے بنکاک آفس کا فون تھا، میں نے فون کیا کسی نے اٹھا بھی لیا، جب میں نے بتایا کہ میں اس طرح سے ائیرپورٹ پر ہوں، تو فون پر

جواب دینے والے نے کہا کہ یہ گیسٹ ہاؤس کا پتہ ہے، ٹیکسی لے کر آ جاؤ۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ گیسٹ ہاؤس بھرا ہوا تھا۔ میں بھی ایک کونے میں لیٹ گیا۔ صبح کو جب ناشتہ کے لئے، کچن میں گیا تو وہاں اصغر علی انجینئر بیٹھے ہوئے مل گئے۔ تسلی ہوئی کہ اب کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد اس کے سیکریٹری صبور آ گئے جن کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے، مگر تھائی لینڈ میں شادی کر کے وہیں آباد ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اول تو چینگ مائی کے لئے میری سیٹ کنفرم کرائی، پھر ان سے تفصیل سے بات چیت ہوئی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے ہندوستان سے بھی مندوبین آئے ہوئے تھے، چونکہ چینگ مائی دوسرے دن جانا تھا، اس لئے فیصلہ ہوا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر بنکاک کی سیر کر لی جائے۔ یہاں ریڈی میڈ کپڑوں اور نمبر دو گھڑیوں کی بھرمار تھی، بہرحال شہر کو دیکھا جب واپسی کا ارادہ کیا تو اب کوئی سواری نہیں مل رہی تھی۔ رکشہ جو ٹک ٹک کہلاتی ہے شاید اتنی دور آنے پر تیار نہیں تھی۔ بسوں میں سوار ہو کر دھکے کھاتے ہوئے، رات کو گیسٹ ہاؤس پہنچے، اور دوسرے دن چینگ مائی کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ شہر موسم سرما کا کیپٹل ہے، صاف ستھرا اور خوبصورت، اس کی مارکیٹ میں سوائے لڑکیوں کے کوئی مرد نظر نہیں آیا۔ تین دن کی کانفرنس تھی، اس کے ختم ہونے پر بنکاک کے ذریعہ واپسی ہوئی۔ تھائی لینڈ میں تینوں وقت چاول کھایا جاتا ہے اس لئے ہم جیسے روٹی خوروں کے لئے وہاں کھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ تھائی لینڈ کے پہلے سفر، اور بعد میں جو تجربہ ہوا وہ یہ کہ ان کے شہر انتہائی صاف ستھرے ہیں، لوگ خاموش رہتے ہیں، میں نے انہیں کہیں لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ گھروں کے آگے پودوں کے گملے رکھے ہوتے ہیں، لڑکیاں مارکیٹ میں دکانوں پر کام کرتی ہیں، اور انہیں پریشان کرنے یا آوازیں کسنے کی کوئی روایت نہیں ہے۔

ایک اور دورے کے موقع پر بنکاک شہر کی تاریخی عمارتیں دیکھنے کو نکلے، ان کے مندر، بادشاہ کے محلات، اور میوزیم اس قدر صاف ستھرے اور خوبصورت تھے کہ میں حیران رہ گیا۔ ان کا دریا میں کشتیوں پر چلتا ہوا بازار دیکھا، دریا کے کنارے جن لوگوں کے گھر ہیں، وہ ان کشتیوں سے دکانداروں سے اشیاء خریدتے ہیں۔ بازار اور مارکیٹ میں کسی قسم کا شور وغل نہیں تھا، لوگ خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ہم جو ہندوستان و پاکستان کے رہنے والے ہیں، جب شہروں کو اس قدر صاف ستھرا دیکھتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں، کیونکہ جیسے ہی آپ جنوب ایشیا

کے کسی ملک میں آئیں تو آپ کو گندگی و غلاظت کے ڈھیر نظر آئیں گے۔

بائنرش بول فاؤنڈیشن کی طرف سے رہنے کا انتظام ایک ہوٹل میں تھا، جو کہ روایتی ہوٹل تھی۔ یہ پھولوں درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی، چونکہ یہاں جرمن، فرنچ، انگریز، امریکن اور دوسرے غیر ملکی آتے ہیں، اس لئے یہاں ایک طوطا ہے، جو مختلف زبانیں سن سن کر ہر زبان کے کچھ نہ کچھ الفاظ بولتا ہے۔ کانفرنس کا موضوع ''این۔جی۔اوز اوران کی کارکردگی'' پر تھا۔ اس میں شرکت کے لئے دوسرے ملکوں کے مندوبین بھی آئے ہوئے تھے۔

اس طرح میرا تعلق اس فاؤنڈیشن سے ہوا، اور پھر میں ان کی ایک میٹنگ میں شرکت کرنے جرمنی روانہ ہوا۔

جرمنی سے واپس آنے کے بعد یہ میرا دوسرا دورہ تھا۔ پہلا دورہ 1993ء میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے تھا کہ جب میں ایک کورس کے سلسلہ میں میونک گیا تھا۔ میونک میں ہم لوگ اس وقت گئے تھے جب میں بطور طالب علم بوخم میں تھا۔ بڑا تاریخی شہر ہے، محلات، میوزیم، تھیٹر، اوپرا ہال اور دوسری شاندار عمارتیں ہیں۔ شہر میں بڑی تعداد ترکوں کی ہے جو یہاں بطور مزدور آئے تھے، اب ان کی دوسری یا تیسری نسلیں یہاں آباد ہیں اور پڑھ لکھ کر اعلیٰ اداروں میں ہیں، مگر نسلی تعصب بہت ہے، ترکوں اور جرمنوں کی لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، ترک بڑے باوقار اور طاقت ور لوگ ہیں، جرمنوں سے ڈرتے نہیں ہیں۔ ان کی جگہ جگہ کھانے پینے کی دکانیں ہیں۔ میں نے اکثر ان کے ہاں ہی کھانا کھایا۔ مہمان نواز بھی بہت ہیں اور چائے کے ساتھ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔

اس زمانے میں یہاں مرتضیٰ رضوی، جرمن زبان کے ایک کورس کے لئے آئے ہوئے تھے۔ یہاں یہ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے آئے تھے۔ ایک دن ملنے آ گئے اور ہم دونوں یہاں انگلش گارڈن گئے۔ خوب گپ شپ ہوئی۔ افسوس ہے کہ پچھلے دنوں ان کا کراچی میں قتل ہو گیا۔ وہ ڈان اخبار میں کام کر رہے تھے اور بہت عمدہ صحافی تھے۔ ان کی وفات ذاتی حیثیت سے بہت افسوس ناک ہے۔ ڈان میں رہتے ہوئے، وہ میرا بڑا خیال کرتے تھے انہوں نے جنرل مشرف پر جو کتاب لکھی ہے اس کے اعتراف میں خاص طور سے میرا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے۔

میونک سے ٹرین میں بیٹھ کر میں بوخم گیا۔ یہاں میں ڈاکٹر فو کو ایولن کا مہمان ہوا، جو یونیورسٹی میں ہسٹری آف ٹیکنالوجی پڑھاتے تھے ان کی بیگم اسٹیشن پر لینے آ گئیں۔ ڈاکٹر ایولن سے پرانی دوستی ہے، اس لئے بڑی شفقت سے ملے۔ دوسرے دن میں یونیورسٹی گیا، شعبہ تاریخ میں اب تک پرانی سکریٹریز تھیں، وہ مل کر بہت خوش ہوئیں۔ اتفاق سے اس دن پروفیسر زائبٹ (Seibt) جو عہد وسطیٰ یورپ کے پروفیسر تھے اور جن کے ساتھ میں نے ایک کورس پڑھا تھا، ان کی الوداعی تقریب تھی۔ وہ بویریا کے رہنے والے ہیں، مل کر خوش ہوئے۔

میں نے ڈاکٹر ایولن سے پوچھا کہ کیا میرے بعد کوئی پاکستانی آیا، تو انہوں نے کہا نہیں۔ اب غیر ملکی طلباء میں کوریا کے طالب علم آ رہے ہیں، شعبہء اسلام میں اور نظِلسٹ سیمینار کے نام سے ہے، وہاں بھی اب جاننے والے نہیں رہے تھے۔

اس عرصہ میں شہر اور یونیورسٹی میں بہت درخت لگ چکے تھے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ پرانے واقف کاروں میں یونس خاں مل گئے جو یہاں انجینئرنگ کے شعبہ میں استاد ہیں۔

جب پرانے دوست ملتے ہیں تو باتیں بھی پرانی ہی ہوتی ہیں۔ راجہ، میں، یونس خاں اور دوسرے دوست جمع ہو جاتے تھے اور تاش کھیلتے تھے۔ یہ سب کچھ ویک اینڈ پر ہوتا تھا، پوری رات اس میں گزر جاتی تھی۔

گزرے ہوئے دن ہمیشہ ہی خوشگوار لگتے ہیں، جب باتیں ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت ٹھہر گیا ہے، مگر جب ہوش میں آؤ تو دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ یونس خاں اور ان کی جرمن بیگم دونوں ہی مہمان نواز اور خلیق لوگ ہیں، میری دوسری مرتبہ ملاقات یونس خاں سے جب ہوئی جب میں 1996ء میں جرمنی گیا تھا۔ اس وقت وہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر، بوخم سے دور ایک ہل اسٹیشن پر مقیم ہو گئے تھے۔

1996ء کے اس دورہ میں، میں نے ہائنرش بول فاؤنڈیشن کی جانب سے ایک کانفرنس میں شرکت کی، جو گلوبلائزیشن پر تھی۔ ایک دن کے لئے میں بوخم گیا، اور وہاں سے پیرس چلا آیا، جہاں میرے پرانے دوست ظفر مسعود ہیں۔ جب پڑھتے تھے تو پیرس آنا ہوتا رہتا تھا۔ اب ایک طویل عرصہ بعد یہاں آنا ہوا۔ یورپ کے شہر بدلتے نہیں ہیں، لوگ ضرور بدل جاتے ہیں۔ لیکن شہر کی عمارتیں، بازار، اور یادگاریں اسی طرح سے رہتی ہیں۔ اگر آبادی میں اضافہ ہو تو عمارتیں شہر

سے باہر تعمیر ہوتی ہیں۔ پیرس کا شہر اپنی نوعیت کے لحاظ سے خوب ہے۔ جس نے فرانسیسی انقلاب کے بارے میں پڑھا ہو تو اسے اس شہر میں وہ عمارتیں اور جگہیں ملتی ہیں کہ جہاں انقلاب کے اہم واقعات ہوئے تھے۔

چونکہ میں اس سے پہلے تاریخی عمارتیں دیکھ چکا تھا، اس لئے اس بار شہر کے بازاروں اور گلیوں میں گھومتا رہا۔ وہ جگہ دیکھی کہ جہاں شہزادی ڈیانا حادثہ میں ماری گئی تھی، اس کے باہر بطور یادگار لوگوں نے پھول رکھ رکھے تھے چونکہ اس کا دوست ایک عرب تھا، اس لئے پھولوں کے ساتھ عربی نعرے، اور اللہ اکبر کے نعرے بھی لکھے ہوئے تھے۔

فرانسیسی انقلاب کے دوران، انقلابی حکومت نے ایک شاندار عمارت تعمیر کرائی تھی جو پین تھیون (Pantheon) کہلاتی ہے۔ اس میں انہوں نے فرانس کے مشہور فلسفی، ادیب، شاعر اور مفکرین کی قبریں ایک ساتھ رکھ دی ہیں۔ یہاں والٹیر، روسو، وکٹر ہیوگو، ایملا زولا، اور دوسرے اہم لوگ ہیں، یہ فرانس کا اپنے دانشوروں کی خدمات کا اعتراف ہے۔

ہائنرش بول فاؤنڈیشن کی جانب سے جرمنی کا تیسرا دورہ 1998ء میں تھا۔ اس مرتبہ ایشین ہاؤس اسن (Asian House Asen) نے اسلام پر ایک کانفرنس کرائی تھی۔ انہوں نے کانفرس کے بعد ہمیں آفن، بون اور برلن کی سیر بھی کرائی۔ برلن میں زمانہ طالب علمی میں گیا تھا اور مشرقی برلن بھی ایک دن کے لئے گئے تھے۔ اب جب سے دیوار برلن ٹوٹی ہے اور جرمنی متحد ہوا ہے، اس شہر کی تعمیر نو ہو رہی ہے، ہر طرف عمارتیں گرائی جا رہی ہیں اور انہیں نئے سرے سے بنایا جا رہا ہے۔

جرمنی میں یہ تعمیر نو محض عمارتوں کی ہی نہیں ہو رہی ہے، بلکہ اس بات کی کوشش بھی ہے کہ دو نظریات کے درمیان جو فرق تھا، جس نے دو ذہنوں کو پیدا کیا، ان کو دور کر کے ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ سابق مغربی جرمنی کے پروفیسر، سابق مشرقی جرمنی کی یونیورسٹی میں جا کر انہیں نئے نظام سے روشناس کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ مشرقی جرمنی والے انہیں لفٹ تھانزا پروفیسر کہتے ہیں، کیونکہ یہ ہوائی جہاز میں ایک دن کے لئے جاتے ہیں اور لیکچر دے کر واپس اپنی یونیورسٹی میں آجاتے ہیں۔ اگرچہ جرمن کو متحد ہوئے کئی برس گزر گئے ہیں، مگر مشرقی اور مغربی جرمنی کے لوگوں کے ذہن ابھی تک چونکہ مغرب والے سرمایہ دار ہیں اور پیسے والے ہیں اس لئے مشرق کے لوگوں

کے لئے ان میں حقارت اورترس کھانے والے جذبات ہیں۔

مشرقی جرمنی کے لوگ اپنے نظام سے مانوس تھے، اس لئے ان کے لئے مشکل ہو رہی ہے کہ وہ سرمایہ داری کے مقابلہ بازی میں حصہ لیں۔ بہرحال وقت کے ساتھ یہ ذہن بھی بدل جائے گا۔

بائنرش بول کی ملازمت ٹھیک ہی جا رہی تھی کہ اچانک وہی ہوا کہ جس کا ڈر تھا۔ ہمیں اپنے پروگرام کے لئے ویب پیج کی ضرورت تھی، اس کو سستا ہندوستان یا پاکستان کے کسی ماہر سے بنوایا جا سکتا تھا، مگر کہا گیا کہ یہ ایک جرمن سے بنوائیں جو تھائی لینڈ میں رہتا ہے۔ اس نے مارکیٹ کے مقابلہ میں ڈبل چارج کئے۔ اس کے بعد ایک تجویز یہ تھی کہ اس سے انٹرنیٹ پر ایک سیمینار یا کانفرنس کرائی جائے تاکہ جو لوگ اس سے ناواقف ہیں، ان کی تربیت ہو۔ ابتداء میں اس نے کہا کہ وہ 100 ڈالر یومیہ لے گا۔ جب تمام تیاری مکمل ہوگئی تو اس کی ای میل آئی کہ وہ 200 ڈالر لے گا۔ میں نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ بلکہ ایک طرح سے بے ایمانی ہے۔ میں نے روشن دھنجی بائی سے بات کی، اور کہا کہ میری جیب سے تو جائے گا نہیں، مگر اصولاً یہ غلط ہے۔ مگر جب ورکشاپ میں، میں اعتراض کروں گا تو تمام جرمن ایک طرف ہوں گے اور میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ بہرحال میں نے اسے لکھا کہ ہم یہ رقم دے تو دیں گے مگر خوشی سے نہیں۔ اس پر اس کو تو آگ لگ گئی اور ہوا بھی یہی کہ جب بنکاک کی اس کانفرنس میں، میں نے یہ بات کی تو تمام جرمن خاموش رہے۔ کسی نے میری حمایت نہیں کی۔ لہٰذا میں نے کہا کہ اگر بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو میرا استعفیٰ بہ حسرت و یاس۔

اس کا آخری پہلو یہ ہے کہ جب میں نے روشن سے کہا کہ میں اس پروگرام کے بارے میں رپورٹ لکھنا چاہتا ہوں، تو اس نے منع کر دیا اور کہا کہ ہمیں اصلیت نہیں چاہئے، بلکہ پریوں کی کہانی چاہئے، اور یہ کہانی میں خود لکھوں گی۔

ایک بار پھر بیروزگاری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لیکن کوئی نہ کوئی حل نکل آتا ہے۔ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور میں پروفیسر ساجدہ وندل نئی پرنسپل ہوگئیں۔ ان سے پرانی ملاقات ہے۔ انہوں نے کہا کہ فرسٹ ایئر میں ایک کورس پڑھایا جاتا ہے، جسے فاؤنڈیشن کورس کہتے ہیں، اس میں طالب علموں کو تاریخ اور سماجی علوم کے بارے میں لیکچرز دیئے جاتے ہیں تاکہ انہیں مختلف

موضوعات سے آگہی ہو۔ انہوں نے مجھے یہ کورس پڑھانے کو کہا۔ میں نے پہلے انکار کر دیا کہ میں اس کالج میں پڑھانے پر تیار نہیں کہ جہاں میری بیٹی عطیہ کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا گیا، مگر انہوں نے اصرار کیا۔ بالآخر میں تیار ہو گیا۔ چونکہ اس میں فرسٹ ایئر کے تمام طالب علم ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ان کی تعداد 150 کے قریب ہو جاتی ہے۔ یہاں پاکستان کے ہر صوبہ سے آنے والے طالب علم ہوتے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہوتے ہیں کہ جو A لیول کے بعد آتے ہیں اور وہ بھی جو انٹر پاس کر کے آتے ہیں۔ نوجوان طالب علموں کو پڑھانے کا ایک اچھا تجربہ ہوا۔ مگر فوراً ہی میرے پڑھانے کا ردِعمل آیا۔ اخباروں میں والدین کی جانب سے خطوط شائع ہوئے کہ میں نوجوانوں کے ذہنوں کو بگاڑ دوں گا چونکہ میں ملک کے نظریہ کے خلاف ہوں۔ اس کے بعد اوپر سے دباؤ آیا کہ مجھے لیکچرز دینے سے فارغ کر دیا جائے۔ پروفیسر ساجدہ وندل نے ان مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور میں جب تک وہ پرنسپل رہیں، یہ کورس پڑھاتا رہا۔ جب راولپنڈی میں کالج کا کیمپس قائم ہوا تو میں وہاں ہر ہفتہ جا کر لیکچر دیا کرتا تھا، بعد میں مہینہ میں دو بار جانے لگا۔

میرا خیال ہے کہ نہ صرف میں نے بلکہ نوجوان طلباء نے بھی میرے لیکچرز میں دلچسپی لی۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا کہ جب پروفیسر ساجدہ ریٹائر ہو گئیں اور ان کی جگہ نئی پرنسپل آئیں۔ ان کا ایک دن فون آیا کہ انہوں نے پنڈی کیمپس میں کسی اور کا انتظام کر لیا ہے۔ اس لئے مجھے زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا شکریہ، اب یہاں بھی کسی اور کا انتظام کر لیں۔

این۔سی۔اے میں، میں ہفتہ میں چار لیکچرز دیا کرتا تھا، جس کا معاوضہ شاید 4 یا 5 ہزار روپیہ ہوتا تھا۔ اس دوران میرے ساتھ دو واقعات اور پیش آئے۔ غزالہ عرفان، جو پنجاب یونیورسٹی میں فلسفہ کی استاد تھیں، وہ پنجاب یونیورسٹی سے لمس LUMS میں چلی گئیں، یہاں یہ سماجی علوم کی کوآرڈینیٹر تھیں۔ انہوں نے ایک دن فون کر کے کہا کہ کیا آپ لمس میں پڑھانے میں دلچسپی رکھتے ہیں، اور ساتھ ہی انہوں نے ملاقات کی خواہش کی۔ میں ان سے ملنے یونیورسٹی گیا۔ کہنے لگیں آپ تاریخ پر کچھ کورس پڑھائیں۔ میں نے کہا ضرور، مگر آپ معاوضہ کیا دیں گی۔ کہنے لگیں کہ ایک لیکچر کے ہزار روپیہ، اس پر میں نے کہا، اتنا سستا میں نہیں ہوں، آپ کی پیش کش کا شکریہ۔

دوسری بار انہوں نے ایک کورس کے 50 ہزار روپیہ کی پیش کش کی جس پر میں نے

انکار کردیا۔

دوسری بار طاہرہ مظہر علی خاں نے کسی سے میرے لئے سفارش کی جولس میں پروفیسر تھیں۔ میں ان سے ملنے گیا، انہوں نے ڈین آف فیکلٹی سے ملوایا۔ ان سے بات چیت ہوئی، وہ بڑے متاثر ہوئے اور کہنے لگے بس اس سمسٹر سے آپ پڑھانا شروع کردیں۔ چلتے وقت نہ جانے کیوں میں نے کہا، آپ کسی سے ذرا میرے بارے میں اور معلومات کرلیں، تو اچھا رہے گا۔ اس کے بعد سے، ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔

اسی دوران دوسرا واقعہ پیش آیا۔ بابر علی فاؤنڈیشن کے صدر کا فون آیا کہ ان کی خواہش ہے کہ میں علی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں بطور ایجوکیشن ایڈوائزر کام کروں، یہ جزوقتی کام ہوگا، معاوضہ اس کا 20 ہزار ہوگا۔ میں نے اس پیش کش کو منظور کرلیا، کیونکہ اس وقت ڈاکٹر انیس عالم کا تقرر یہاں بطور ڈائریکٹر کے ہوگیا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اچھا ہے، ان کا ساتھ بھی رہے گا۔ جب میں نے جوائن کیا تو اول تو مسئلہ یہ آیا کہ میں کہاں بیٹھوں، انیس عالم نے کہا کہ کانفرنس روم میں بیٹھ کر کام کرو، جب کانفرنس ہو تو کسی اور جگہ بیٹھ جانا۔ لیکن وہاں کے اسٹاف نے اپنی ریسرچ کے سلسلہ میں مجھ سے کوئی زیادہ مدد نہیں لی۔ میں نے لیکچرز بھی دو چار ہی دیئے ہوں گے۔ لہٰذا میں سوچنے لگا کہ یہاں میری ضرورت کیا ہے؟ ایک دن میں بیٹھا کام کررہا تھا کہ ایک صاحب بھاگتے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ بیگم بابر علی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید رسمی ملاقات ہوگی۔ اس لئے ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ کمرے میں دو چار اساتذہ بیٹھے ہیں، ان میں میں نے دیکھا کہ وہ انسٹی ٹیوٹ کے اسٹاف کے لوگوں سے انٹرویو لے رہی ہیں۔ ان میں ایک انگریز بھی تھا جو کسی برٹش ادارے سے یہاں آیا ہوا تھا۔ جب ایک استاد نے اردو میں بولنا شروع کیا تو انہوں نے فوراً کہا انگریزی میں بات کریں تاکہ یہ انگریز بھی سمجھ سکے۔ میں اس عمل کو دیکھتا رہا۔ بیگم صاحبہ کا انسٹی ٹیوٹ سے صرف اتنا واسطہ تھا کہ یہ ان کے خاندان کی ملکیت ہے۔ جب میری باری آئی تو پوچھنے لگیں آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟ میں نے مختصر جواب دیا کہ میں لیگل ایڈوائزر ہوں۔ اس مختصر ملاقات کے بعد میں انیس عالم کے پاس گیا اور کہا بھائی، اس ذلت سے اچھا ہے کہ اس ملازمت سے دستبردار ہوا جائے۔ میں کل سے نہیں آؤں گا۔ انیس عالم بھی اس دخل اندازی سے بے زار تھے، کہنے لگے کہ یہ آجاتی ہیں، اسٹاف کو بلا کر ان سے ان کے

مسائل سنتی ہیں، اور بحیثیت ڈائریکٹر انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انیس عالم کو بھی وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

دراصل نجی اداروں کو ان کے مالک اپنی جاگیر سمجھتے ہیں، اور کام کرنے والوں کو مزارع۔ ان کے نزدیک کسی کے علم و فضل کی کوئی عزت نہیں ہے۔ جب چاہیں کسی کا تقرر کر دیں اور جب چاہیں اسے فارغ کر دیں۔ ملازم اس ذلت کو اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ یہ ان کے روزگار کا مسئلہ ہوتا ہے۔ نجی اداروں میں تو یہ سلسلہ ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کے اداروں میں لوگ اس لئے کام نہیں کرتے کہ ان کی ملازمت بھی ہوتی ہے اور نکالے جانے کا خطرہ نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا۔

یہ تو رہا سلسلہ ملازمتوں کا اس کے علاوہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ ہے مگر اس ملک میں محض قلم کے ذریعہ روزی کمانا ناممکن ہے، جب تک میں سندھ یونیورسٹی اور گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی ملازمت میں تھا، لکھنے کا مقصد روزی نہیں تھا، یہ ایک مقصد کے لئے تھا۔

پاکستان میں لکھاریوں کے لئے ریڈیو، ٹی وی، اور اخبارات ہیں۔ لیکن چند ایسے حضرات ہیں کہ جن کی علمی و ادبی حیثیت اس قدر مضبوط اور شہرت یافتہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں کے سہارے روزی کما کر خوش حالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جب میں سندھ یونیورسٹی میں تھا تو اس وقت نذیر لغاری، جو ایک مشہور صحافی ہیں جنگ میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے پیغام دیا کہ وہ ایڈیٹوریل صفحہ کے انچارج ہو گئے ہیں اس لئے ان کے لئے لکھیں۔ میں نے کوئی پندرہ یا بیس مضامین لکھے، جو قارئین نے پسند بھی کئے۔ لیکن اردو اخباروں میں مجھ جیسے کالم نگاروں کو معاوضہ دینے کا رواج نہیں ہے۔

انگریزی اخبار میں لکھنے کا سلسلہ اس وقت ہوا، جب میں لاہور میں نیا نیا آیا تھا۔ خالد احمد جب فرنٹیئر پوسٹ کے ایڈیٹر ہوئے تو انہوں نے ہفتہ وار کالم لکھنے کو کہا۔ ان کے کہنے پر میں نے لکھنا شروع کیا، چونکہ اس اخبار میں نئے لکھنے والے تھے اور نئے خیالات کے ساتھ کالم لکھتے تھے اس لئے یہ اخبار بہت جلد ملک میں مقبول ہو گیا۔ میری دو کتابیں Historian's Dispute اور In The Shadow of History اس اخبار میں لکھے ہوئے کالموں کا مجموعہ ہے۔

افسوس کہ یہ اخبار انتظامیہ کے بدلنے اور خالد احمد کے چھوڑنے کے بعد روز بروز گرتا چلا

گیا۔ میں نے بھی اس میں لکھنا چھوڑ دیا۔

اردو اخبار میں لکھنے کا دوسرا تجربہ اس وقت ہوا کہ جب خالد احمد روزنامہ آجکل کے ایڈیٹر ہوئے، ان کے کہنے پر میں نے اخبار میں لکھنا شروع کیا۔ دوسرا یہ اخبار زیادہ دن نہیں چلا اور بند ہوگیا۔ دوسری مرتبہ پھر اسے ڈیلی ٹائمز کے ساتھ نکالا گیا۔ جواب تک نکل رہا ہے۔ مگر اس بار میں نے اس میں نہیں لکھا۔

ڈان اخبار میں لکھنے کی ابتداء، اس کے سنڈے میگزین سے ہوئی۔ بیچ میں، میں نے چھوڑ دیا۔ دوبارہ مرتضٰی رضوی کے اصرار پر لکھنا شروع کیا۔ اب میں اس میں پابندی سے لکھ رہا ہوں۔

مرتضٰی رضوی کے کہنے پر میں نے ینگ ورلڈ میں، بچوں کی کتابوں کا جو میں نے اردو میں لکھی تھیں، ان کا ترجمہ شائع کراتا رہا۔ اس بہانے سے یہ چھ جلدوں پر مشتمل کتاب انگریزی میں بھی منتقل ہوگئی ہے۔

ڈان اخبار کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ادائیگی میں کبھی دیر نہیں لگاتے ہیں، اور معاوضہ کا چیک پابندی سے ہر مہینہ آجاتا ہے۔ افسوس کہ یہ خصوصیت دوسرے اخباروں میں نہیں ہے۔

میری خواہش یہ رہی ہے کہ میں اردو میں لکھوں، مگر اردو اخبار والا کوئی پیش کش نہیں کرتا ہے۔ ہاں ایک مرتبہ جب طاہر ملک روزنامہ وقت کے ایڈیٹر ہوئے تو انہوں نے مجھ سے کالم لکھنے کو کہا۔ جب تک وہ روزنامہ وقت میں رہے اس وقت تک پابندی سے معاوضہ بھی آتا رہا، ان کے جانے کے بعد اخبار کے حالات خراب ہوئے اور اسے جنگ اخبار نے خرید کر ڈمی بنا دیا ہے۔ مجھے یہ اخبار کئی لحاظ سے پسند تھا۔ اس کی فارمیٹ دوسرے اردو اخباروں سے مختلف تھی، اہم خبریں صفحہ اول پر ہوتی تھیں بقیہ صفحہ والی بات نہیں تھی۔ کالم نگار بھی اچھے تھے، اخبار مقبول ہو رہا تھا، اس مرحلہ پر اسے بند کر دیا گیا۔

آجکل اردو کے کئی اخبار نکل رہے ہیں، مگر افسوس ہے کہ کسی میں جدت اور اختراع نہیں ہے، جو روایت پہلے سے پڑ چکی ہے سب اسی پر چل پڑتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کس قدر ذہنی بنجر پن ہے۔

اب ذکر نجی ٹی وی چینلز کا ہو جائے۔ جب ان کی ابتداء ہوئی تو امید تھی کہ پی۔ ٹی۔ وی کی اجارہ داری ختم ہوگی اور یہ چینلز اچھے، علمی و معلوماتی پروگرام شروع کریں گے۔ افسوس یہ

ہے کہ ابتداء ہی سے انہوں نے اس پالیسی کو اختیار کیا کہ پروگرام میں شرکت کرنے والوں کو کوئی معاوضہ نہیں دیا جائے۔شروع میں تو ان کے پروگراموں میں شوق کے ساتھ شرکت کی مگر پھر احساس ہوا کہ یہ اشتہاروں کے ذریعہ اتنا کماتے ہیں، اور شرکت کرنے والوں کو کچھ نہیں دیتے۔ جب کہ پی۔ٹی۔وی ابتداء ہی سے معاوضہ ادا کرتا رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے اکثر چیک راستہ ہی میں سے غائب ہو جاتے ہیں۔اس لئے ایک وقت وہ آیا کہ میں نے پروگراموں میں شریک ہونا بند کر دیا۔اب اگر گھر پر آ کر کوئی چینلز ریکارڈ کر لیتا ہے تو اس سے میں انکار نہیں کرتا۔

اسی زمانہ میں قیوم نظامی اسٹار ایشیا نامی چینلز پر پروگرام کرتے تھے۔مجھ سے کہنے لگے کہ یہ نیا اور چھوٹا چینلز ہے، اس لئے پیسے کم دے گا، مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر کوئی پروگرام شروع کر دیں۔انہوں نے میری ملاقات اس کے مالک اقبال سندھو سے کرائی۔انہوں نے کہا کہ فی پروگرام چار ہزار دیں گے آپ تاریخ کے موضوعات پر پروگرام شروع کر دیں۔ میں نے کوئی تیرہ پروگرام کئے، جبکہ ایک بھی پروگرام کا معاوضہ نہیں ملا تو تنگ آ کر چھوڑ دیا۔ نظامی صاحب بڑے شرمندہ ہوئے، مگر کیا کر سکتے تھے۔ میں نے معاوضہ کی ادائیگی کا ان پر مقدمہ بھی کیا، مگر ہماری عدالتوں کا جو حال ہے، میں بھول گیا کہ کوئی مقدمہ کیا ہے۔شاید یہ ابھی تک عدالت کے ریکارڈ میں ضرور ہوگا۔

اب ذرا پی۔ٹی۔وی کا حال سنئے۔ 2011ء کی بات ہے کہ ایک دن فون آیا کہ قمر الزمان کائرہ، انفارمیشن وزیر ملنا چاہتے ہیں، میں نے کہا، ضرور آ جائیں۔ وہ آ گئے۔ بڑے ادب اور احترام سے ملے۔ گھنٹے دو گھنٹے ان سے بات چیت رہی۔ کہنے لگے کہ اگر آپ پی۔ٹی۔وی پر کوئی پروگرام کریں تو خوشی ہوگی۔ میں نے کہا میں تیار ہوں، صرف دو شرطیں ہیں، ایک تو اس کا آپ کی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، دوسرا اسے سنسر نہیں کیا جائے گا۔وہ کہنے لگے ضرور ایسا ہی ہوگا۔

میں نے ندیم عمر، جو کہ این۔سی۔اے میں استاد رہے اور پرانے دوست ہیں ان کے ساتھ مل کے تاریخ اور آج کی دنیا کے نام سے پروگرام شروع کیا۔ پی۔ٹی۔وی جا کر احساس ہوا کہ اگرچہ وزیر کے کہنے پر ہمیں یہ پروگرام تو مل گیا ہے، مگر وہاں تو جیسے قیامت آ گئی۔ ضیاء الحق کی باقیات ان اداروں میں پوری طرح سے باقی ہیں، لہٰذا ہمارے پروگرام کو خراب

کرنے کا آسان طریقہ یہ ہوا کہ اس کے نشر ہونے کے اوقات بار بار بدل دیئے جاتے تھے۔ کبھی رات کو 11 بجے، کبھی دن میں 2 بجے، اور کبھی شام میں 6 بجے پروگرام چلتا رہا۔ اسی دوران کابینہ میں ردو بدل ہوا، جناب کائرہ انفارمیشن وزیر سے پارٹی کے ترجمان بن گئے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارا پروگرام بھی بند ہو گیا۔

ہمارے دوست وسیم احمد نے اس پروگرام کے کچھ حصوں کو یو۔ٹیوب پر ڈال دیا ہے۔ ہم نے اپنی دانست میں کوشش کی تھی کہ اسے علمی پروگرام رکھیں، جن اہم موضوعات پر اس میں لیکچرز دیئے گئے وہ نصابی کتابیں، نیشنل ازم، کولونیل ازم، انقلاب، تہذیب، کلچر اور قانون تھے۔ جن لوگوں نے یہ پروگرام دیکھے انہیں پسند آئے۔ لیکن لوگوں کی پسند اپنی جگہ پی۔ٹی۔وی کے صاحب اختیار لوگوں کی دلچسپی اپنی جگہ۔ لہٰذا یہ تجربہ بھی تقریباً ناکام ہی رہا۔

اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے لئے روزگار کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ لیکن حالات انسان کو زندہ رہنا سکھا دیتے ہیں۔ یونان کے فلسفی اے پی کیورس (Epicurus) نے کہا تھا کہ انسان کو اپنی ضروریات کم کرنی چاہئیں، اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر مطمئن ہو کر خوشی و مسرت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہئے۔

میں نے اپنی پوری زندگی میں اپنی شرائط پر ملازمت کرنے کی کوشش کی جب میں اس میں ناکام ہوا تو ملازمت چھوڑ دی۔ اس سلسلہ میں، میں اپنی بیگم اور بچیوں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور کبھی اس پر گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا کہ ہمارا گزارا کیسے ہو گا۔ گزارا بھی ہو گیا اور شکر ہے کہ میں نے کبھی کسی سے نہ قرض لیا اور نہ اپنی بیروزگاری کے بارے میں کسی سے بات کی۔ ان حالات میں مرزا غالب میری ہمت افزائی کرتے رہے۔

زندگی اپنی جو اس طور سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

دوستی

زمانے کے ساتھ دوستی کا تصور بھی بدلتا رہتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ معاشرے میں اس قدر حرکت نہیں تھی اور لوگ اپنے شہروں، قصبوں اور گاؤں سے کم ہی نکلتے تھے، آبادی کم تھی، لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے، ہر خاندان کی اپنی شناخت تھی۔ اس لئے جب دوستی ہوتی تھی تو اس کی حیثیت پائیدار ہوتی تھی، یہ زندگی بھر کی ہوتی تھی۔ ایک طرح سے دوست رشتہ داروں سے بڑھ جاتے تھے۔ یہ خوشی اور غمی میں برابر کے شریک ہوتے تھے اور جذباتی طور پر ایک دوسرے سے گہرے بندھنوں میں جکڑے ہوتے تھے لیکن وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا ہے۔ کمیونی کیشن کے بڑھنے اور روزگار کی تلاش میں جانے کے لئے لوگ اپنے آبائی شہروں اور قصبوں سے نکلے، اور ایک شہر سے دوسرے شہر کا دورہ کرنے لگے۔ ان کے آبائی گھر تو برقرار رہے، مگر اب وہاں سال یا کئی سالوں بعد جانا ہوتا، اور پرانے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی، تعلقات کے بندھن کمزور ہوتے چلے گئے۔

جب اپنے گھروں سے نکل کر دوسرے شہروں میں گئے تو یہاں نئی دوستیاں ہوئیں۔ یہ دوستیاں یا تو ہم جماعتوں میں ہوتی تھیں، یا آفس میں کام کرنے والوں کے ساتھ۔ لیکن یہ دوستیاں وقت کے ساتھ بدلتی رہتی تھیں۔ ان میں پائیداری نہیں تھی۔ بعض دوستیاں مفادات کی بنیاد پر ہوتی تھیں، جیسے ہی مفادات ختم ہوئے، دوستی بھی جاتی رہی۔

دوستی کا آغاز محلّہ سے شروع ہوا کرتا تھا اس کے بعد اسکول، کالج یا یونیورسٹی کے ہم جماعت ہوتے تھے اور پھر آفس کے ساتھی۔ ان کے علاوہ اگر کسی کو کھیل سے، ادب، موسیقی اور آرٹ سے دلچسپی ہوتی تھی تو ان سے دوستی کا سلسلہ قائم ہو جاتا تھا۔

میری دوستی کی ابتداء بھی اسی طرح سے ہوئی، محلّہ کے دوست تھے، جن سے رشتہ اس وقت

ٹوٹا جب ہم ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔اب ان دوستوں کی محض یاد باقی رہ گئی ہے۔ان کے نام بھی بھول چکا ہوں۔ٹونک میں ہم جماعتوں کے نام تو یاد ہیں، مگر پاکستان آنے کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ ہمارے دوست عزیز خاں، اس وقت کے دوست ہیں، جو اب کراچی میں رہتے ہیں، ان کے چھوٹے بھائی سے پاکستان آنے کے بعد پھر ملنا نہیں ہوا، عزیز خاں کو اب تک تاش کی بازیاں یاد ہیں، جو بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔

پاکستان آنے کے بعد جن لوگوں سے محلّہ یا طالب علمی کے زمانے کی دوستی تھی، وہ ایک خاص وقت تک تو باقی رہی، اس کے بعد یہ میرے دوست بکھر گئے اور کوئی مستقل رابطہ نہیں رہا۔

اس عمر میں آنے کے بعد یہ تجربہ ہوا کہ جب دوستوں سے رابطہ نہیں رہے تو فاصلے بڑھ جاتے ہیں۔اگر بعد میں کسی مرحلے پر پرانی دوستی کو دوبارہ سے قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں کامیابی نہیں ہوتی ہے۔میرے کئی پرانے دوست کہ جن سے دن رات ملنا ہوتا تھا، جب ان سے رابطہ ٹوٹا اور کئی سالوں بعد ملنا ہوا تو چند پرانی یادوں کو بیان کرنے کے بعد بات چیت کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا۔اس کا تعلق انسان کے اپنے خیالات اور نظریات سے بھی ہوتا ہے۔اس صورت میں دوستی کا احیاء نہیں ہو سکتا ہے۔

میرے ایک دوست رشید نیاز تھے، نہ جانے کیوں دوستوں نے انہیں رشید آڑو کہنا شروع کر دیا تھا۔ان کا دستور تھا کہ یہ سرِ شام گھر سے نکلتے تھے اور دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں میں گپ شپ کرتے تھے۔اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا، بالوں کو خاص طور سے بڑا سنوارتے تھے۔جب ہیرو بن کر گھر سے نکلتے تھے، تو جاننے والے ان سے سلام دعا کرتے ہوئے ان سے ملاقات کرتے تھے۔محلّہ کی ایک لڑکی ان کے دامِ محبت میں گرفتار ہوگئی۔اس لئے وہ خاص طور سے اس کھڑکی کے آگے سے گزرتے اور نظروں نظروں میں سلام و پیام محبت کا تبادلہ ہوتا تھا۔

یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہیں چلا۔ایک دن لڑکی کا بھائی ان سے ملنے آیا اور بڑے دلسوز انداز میں اس نے کہا کہ اس کی وجہ سے اس کے خاندان میں بڑی پریشانی ہے، اور ان کی بدنامی ہو رہی ہے۔رشید آڑو اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنی محبت کو قربان کر دیا اور اس گلی سے اپنا رشتہ توڑ دیا۔

وہ رات کے جاگنے والے تھے۔اس لئے کبھی بارہ یا دو بجے وہ آتے اور مجھے سوتے سے اٹھا

کر کسی اور دوست کے گھر پہنچ جاتے، جب چار پانچ دوستوں کو جمع کر لیتے تو ہوٹلوں کا رخ کرتے تھے۔ ایک ایک کر کے جب ہوٹل بند ہوتے تو آخری ہوٹل ریلوے اسٹیشن کا ہوتا تھا۔ جب صبح کے آثار نمایاں ہونے لگتے تو وہ رخصت ہو کر سونے چلے جاتے تھے۔

رشید کو ہزاروں کی تعداد میں اشعار یاد تھے۔ رات بھر وہ ہر قسم کے اشعار سناتے رہتے تھے۔ میں چونکہ مباحثوں میں بولتا تھا، مگر میرا کوئی اچھا مقرر ساتھی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ایک مباحثہ کے لئے انہیں تیار کیا۔ انہوں نے تقریر یاد کی، اور ایکشن کے ساتھ اس کو بار بار دھرایا۔ جب ہم مباحثہ میں شرکت کے لئے گئے، اور ان کا نام پکارا گیا تو اسٹیج تک تو وہ بڑے اطمینان کے ساتھ گئے، اور صاحب صدر کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی جانب دیکھ کر ہاتھ کو ہلا کر کہا، جناب صدر، اس کے بعد وہ اسی پوز میں جم کر رہ گئے. کیونکہ بقیہ تقریر وہ بھول گئے۔ جب سامعین کی جانب سے شور ہوا تو وہ بڑے وقار سے اسٹیج سے اتر آئے۔ وہ اس وقت تو یہ تقریر بھول گئے، مگر یہ تقریر انہیں پوری زندگی یاد رہی۔

میرے ساتھ ہی تاریخ میں ایم۔ اے کیا اور اس کے بعد حیدرآباد سندھ سے ایک انگریزی اخبار انڈس ٹائم میں کام کرنے لگے۔ بعد میں کراچی چلے گئے اور ڈان اخبار کے اسپورٹس صفحہ میں ان کی مشغولیت ہوگئی۔ اس عرصہ میں، میں پاکستان سے باہر رہا، واپسی پر ہمارے مشترک دوست اسلم حیات کے ساتھ کراچی میں ملاقات ہوئی، مگر محسوس ہوا کہ ان میں اور مجھ میں خیالات کے اعتبار سے بہت فرق ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ بالکل ملنا نہیں ہوا۔ یہ 1986ء کی بات ہے کہ میں ڈان اخبار میں محمد علی صدیقی صاحب کو انٹرویو دے کر آیا، راستہ میں ایک صاحب نے گرم جوشی سے سلام کیا۔ میں نے ان صاحب کو پہچانا نہیں۔ اس پر اس نے حیرت سے کہا کہ ''میں رشید ہوں''۔ اب جو میں نے غور سے دیکھا تو اس کے سر کے بال غائب ہو چکے تھے، جس کی وجہ سے اس کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد گرم جوشی سے ملے۔ ایک دوسرے کا حال پوچھا اور فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے چار پانچ منٹ بات ہوئی۔

اس کے بعد سے رشید سے ملنا نہیں ہوا، شاید تین سال ہوئے اس کی کینسر میں وفات ہوگئی۔ یہ خبر ڈان میں پڑھی۔ تھوڑی دیر کے لئے پرانی یادیں آئیں، اور پھر وہی زندگی، اور اس کی تلخیاں۔ زندگی کی شاہراہ پر لوگ. ملتے اور بچھڑتے رہتے ہیں۔

میرے دوست مشترک دوست ظفر حسن شاہ تھے۔ جغرافیہ میں ایم۔اے کر کے یہ وہیں استاد ہو گئے تھے۔ اگر چہ یہ ہم سے سینئر تھے، مگر دوستی ہوگئی۔ یہ دوستی اس وقت اور بڑھ گئی کہ جب میں بھی یونیورسٹی میں پڑھانے لگا۔ ان کا شعبہ ہمارے سامنے تھا۔ اس لئے روز ملاقات ہوتی۔ ہم نے مل کر یونیورسٹی میں ایک کلب کی بنیاد ڈالی، کہ جس میں ڈاکٹر احمد بشیر، ڈاکٹر احسن فاروقی، اور پروفیسر جمیل واسطی بھی تھے۔ یہاں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی اپنا افسانہ یا مضمون پڑھتا تھا۔ ظفر شاہ نے اس زمانے میں کئی اچھے افسانے لکھے۔ یہ دوستی اتنی بڑھی کہ صبح شام ملنا ہونے لگا۔ پھر ہم دونوں واپڈا کے ٹینس کلب میں ٹینس کھیلنے جانے لگے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلا کہ میں پڑھنے کے لئے باہر چلا گیا۔ کچھ عرصہ ان سے خط و کتابت رہی، مگر پھر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جب میں 1976ء میں واپس آیا تو دیکھا کہ ظفر شاہ بہت بدل گئے ہیں۔ اب وہ سخت سندھی قوم پرست ہو گئے تھے۔ اردو میں لکھنا چھوڑ دیا تھا اور سندھی میں لکھتے تھے۔ کوشش کے باوجود وہ قربت اور دوستی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ملنا ہوتا تھا، مگر اب یہ روایتی ہو گیا تھا۔ وہ اپنے نظریات میں اس قدر پختہ ہو گئے تھے کہ بات بات پر لوگوں کا بائیکاٹ کرتے تھے۔ مثلاً جو سندھی ادیب ضیاء الحق کی اہل قلم کانفرنس میں گئے ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس بائیکاٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اکیلے رہ گئے ان کے پرانے دوست ہی ان سے دور ہو گئے۔

میں 1989ء میں یونیورسٹی چھوڑ کر لاہور چلا آیا۔ ان سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی کہ جب میں حیدرآباد گیا ہوا تھا، وہاں میرا لیکچر تھا، جس میں وہ آئے تھے۔ اچھی ملاقات رہی، اس کے بعد سنا کہ حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔

انہوں نے سندھی صحافت میں دو بہت اچھے رسالے نکالے تھے۔ جن کا ادبی معیار بہت اچھا تھا۔ ان میں سے ایک سوہنی تھا، جو طارق اشرف کے ساتھ مل کر نکالا تھا دوسرا دھرتی تھا۔

سندھی کی ترقی، اور سندھی زبان کو معیاری زبان بنانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی وفات کے بعد شاید ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

اگر چہ اور ہمارے دوستوں میں دوری ہوگئی تھی۔ مگر جب ملتے تھے تو پرانی یادیں یاد آجاتی تھیں اور کہتے تھے کہ وہ وقت اچھا تھا کہ جب دوستوں میں خلوص تھا۔ ان کے اس طرح بدلنے کا مجھے افسوس ہے۔ سیاست اور سیاسی رویہ کیسے لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کر کے انہیں

اجنبی بنادیتے ہیں۔

مجھے ظفر حسن شاہ کی موت کا بہت افسوس ہے اور افسوس اس بات پر بھی ہے کہ سندھ میں سندھی مہاجر تفریق اور فسادات نے کتنے اچھے اور نیک دل انسانوں کو بدل کر رکھ دیا۔ عمر بھر کی دوستی ان پر قربان ہوگئی۔

ظفر حسن شاہ کے ساتھ ہی مجھے نایاب حسین بھی یاد آئے۔ یہ ہم سے بہت سینئر تھے، مگر ان کے قصے ہم نے سن رکھے تھے۔ یہ سندھ یونیورسٹی میں اس وقت طالب علم تھے کہ جب علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے طلباء یونین کا الیکشن لڑا اور جنرل سیکریٹری منتخب ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی میں وائس چانسلر سے تعلقات خراب ہوگئے۔ جب یونین کے افتتاحی اجلاس کا وقت آیا تو وائس چانسلر نے کہا کہ وہ جو تقریر کریں، پہلے انہیں دکھا دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، مگر جب تقریر کا وقت آیا تو جیب سے دوسری تقریر نکال کر پڑھی جس میں یونیورسٹی پر تنقید تھی۔ وائس چانسلر نے اس جرم میں انہیں یونیورسٹی سے نکال دیا۔ شاید اس واقعہ سے پہلے وہ انگریزی میں ایم۔ اے کر چکے تھے اور کسی دوسرے مضمون میں داخلہ لیا تھا۔ ان پر حکومت کے تعلیمی اداروں کے دروازے بند ہوگئے۔ مگر ان کی طبیعت بڑی قلندرانہ تھی۔ انہوں نے حیدرآباد میں ارژنگ نامی ایک سوسائٹی بنائی، اس کے تحت ڈرامے اور ادبی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ حمایت علی شاعر بھی اس وقت حیدرآباد میں تھے وہ بھی اس کے اہم ممبر تھے۔ نایاب حسین نے انگریزی مباحثوں میں مقررین کی تربیت کی، انہیں تقریر لکھ کر دیا کرتے تھے۔

ہم نے ان کی شہرت سن رکھی تھی کہ انگریزی کے ماہر ہیں، خوبصورت انگریزی لکھتے ہیں، اور شاعری بھی کرتے ہیں۔ ملازمت انہوں نے کہیں بھی مستقل نہیں کی۔ سندھ کالج آف کامرس میں پڑھانا شروع کیا، تو کئی کئی دن آتے ہی نہیں تھے۔ جب آجاتے تھے تو پھر کسی اور کو کلاس نہیں لینے دیتے تھے، خود پڑھاتے رہتے تھے۔

حیدرآباد سے ایک انگریزی اخبار انڈس ٹائم نکلا، مگر جس اہتمام سے نکلا تھا، کچھ عرصہ بعد اس کو زوال آگیا۔ دراصل کراچی حیدرآباد کو کھا گیا، کیونکہ کراچی کے اخبار صبح صبح آجاتے تھے، ان کے سامنے حیدرآباد کے اخبارات نہیں چل پاتے تھے۔ انڈس ٹائم کے آخری دنوں میں نایاب صاحب اس کے ایڈیٹر ہوگئے۔ یہاں تک کہ یہ اخبار بالکل بند ہوگیا۔

ان سے میری دوستی، جرمنی سے آنے کے بعد ہوئی۔ شکیل پٹھان کے دوستوں کا ایک گروپ تھا۔ یہ نوجوان تھے اور ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔ نایاب صاحب ان کی ذہنی تربیت میں مصروف تھے۔ میری ملاقات شکیل پٹھان نے کرائی، جو بہت جلد گہری دوستی میں بدل گئی۔ حسب معمول یہ بیروزگار تھے، صبح گھر سے نکلتے تھے اور رات کو واپسی ہوتی تھی، اگر گیٹ نہیں کھلتا تھا تو یہ دیوار پھلانگ کے گھر میں جاتے تھے۔ اس وقت پیپلز پارٹی کی حکومت تھی، اور ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم تھے۔ نایاب صاحب نے ایک ناولٹ ''منکی بزنس'' کے نام سے لکھا جس میں پارٹی اور اس کے لیڈر پر گہرا طنز تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی ان کے پیچھے پڑ گئی تو یہ کچھ عرصہ کے لئے روپوش ہو گئے۔

اس زمانے میں میرے پاس سوزوکی اسکوٹر ہوا کرتی تھی۔ نایاب صاحب اور میں اس پر بیٹھ کر شہر میں گھوما کرتے تھے۔ ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ ریڈیو پاکستان کے کچھ پروگرام تھے، وہ ان کے سگریٹوں کے لئے کافی ہوا کرتی تھی۔ باقی کھانے کے سلسلہ میں وہ بے نیاز تھے۔ اگر مل گیا تو کھا لیا، ورنہ اسی طرح گزارا کیا۔ بحیثیت انسان کے بہت نیک دل اور ہمدرد تھے۔ نوجوانوں کی مدد کرنے پر ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے حیدرآباد میں میرا دل لگ گیا تھا۔ ان سے بات چیت ہوتی، بحث مباحثہ ہوتا اور ان سے سیکھنے کا موقع ملتا۔

پھر ہوا یہ کہ انہوں نے شادی کر لی، اور ان کی بیگم انہیں لے کر سویڈن چلی گئیں۔ نایاب صاحب شہر کو اداس چھوڑ کر چلے گئے۔ ان سے کوئی رابطہ بھی نہیں رہا، اور وقت کے ساتھ ان کی موجودگی کا احساس بھی نہیں رہا۔ شاید تین، چار سال کے بعد اچانک ایک دن وہ گھر پر آ گئے۔ سویڈن جانے کے بعد یہ ان کا پہلا پاکستان آنا تھا۔ ابھی تک وہی جوش و خروش تھا کہ کچھ کرنا چاہیئے وہ واپس آنے کو تیار تھے۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری تو ہوئی مگر اس طرح کہ سویڈن ہی میں حرکت قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہو گیا اور یہ جسد خاکی دفن ہونے کے لئے حیدرآباد آیا۔

اس دنیا سے رخصت ہونے والے دوستوں میں دو کا ذکر ضروری ہے۔ زبید احمد فردوسی اور خالد وہاب، یہ دونوں سٹی کالج حیدرآباد میں پروفیسر تھے۔ زبید نے پہلے پولیٹکل سائنس میں ایم۔ اے کیا تھا اور سٹی کالج میں فوراً ہی ملازمت مل گئی تھی، بعد میں میرے ساتھ تاریخ میں

ایم۔اے کیا۔ان سے میری دوستی اسی زمانے میں ہوئی۔

خالد وہاب صاحب اردو کے لیکچرر ہوکر سٹی کالج میں اس وقت آئے جب میں بی۔اے کے آخری سال میں تھا، انہوں نے ہمیں کچھ مہینے پڑھایا بھی، بڑے شرمیلے انسان تھے۔ان دونوں کی بڑی دوستی تھی۔خیالات کے اعتبار سے بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے اور اساتذہ کی سیاست میں حصہ لیتے تھے۔جب لاہور کے اسلامیہ کالج سے پروفیسر منظور، پروفیسر امین مغل اور دوسرے اساتذہ کو ان کے خیالات کی بنا پر نکالا گیا تو ان لوگوں نے زبردست احتجاج کیا۔ مجھے یاد ہے کہ سٹی کالج میں پاکستان کے اساتذہ کا ایک بڑا جلسہ ہوا، جس میں پنجاب سے بھی کافی اساتذہ آئے۔

زبید فردوسی کچھ عرصہ کے لئے میرے پاس جرمنی بھی آئے۔ارادہ پی۔ایچ۔ڈی کرنے کا تھا، مگر حالات سے مجبور ہوکر واپس چلے آئے۔جب میں واپس آیا ہوں تو یہ سٹی کالج ہی میں تھے۔اس دوران انہوں نے دو کتابیں لکھیں ''ریشمی رومال کی تاریخ'' اور ایک انگریزی میں ''Eagles over Pakistan'' جو لاہور سے شائع ہوئیں۔ان حضرات کا اساتذہ میں اچھا خاصا اثر تھا۔مجلسی لوگ تھے، ابتداء میں یہ کالج سے اٹھ کر صدر شہر میں واقع پریم پارک میں آجاتے تھے، جہاں کینٹین سے چائے آتی رہتی تھی، درختوں کے نیچے بیٹھنا، بڑا خوشگوار لگتا تھا۔افسوس کہ اس خوبصورت پارک پر آرمی نے قبضہ کرکے وہاں مکان اور فلیٹس تعمیر کرادیئے اور شہریوں کو تفریح سے محروم کردیا۔

بھٹو صاحب کے زمانے میں جب کالجوں کو قومیا گیا تو خالد صاحب کا بدین کے کالج میں بحیثیت پرنسپل تبادلہ کردیا۔زبید سٹی کالج میں رہے، جہاں وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔میں اکثر ملنے چلا جایا کرتا تھا، ان کے پاس ہر وقت دوستوں کا ہجوم رہتا تھا۔

بعد میں ان کی ہفتہ وار مجلس فاران ہوٹل میں ہوتی تھی، یہاں بھی میں کبھی کبھی چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد دوستوں کا یہ دستور ہوگیا تھا کہ سال میں ایک مرتبہ خالد وہاب صاحب کے پاس بدین جایا کرتے تھے۔وہ ایک مقبول پرنسپل تھے، اساتذہ اور طالب علم سب ہی ان کی عزت کرتے تھے۔ایک زمانہ میں، انہوں نے کچھ افسانے لکھے، مگر بعد میں لکھنے کا سلسلہ ختم ہوگیا، مگر پڑھنے کا ذوق وشوق جاری رہا۔

زبیدسگریٹ بہت پیتے تھے، شاید اس کی وجہ ہو کہ انہیں دل کا مرض لاحق ہو گیا۔ مگر انہوں نے کبھی اس مرض کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ ڈاکٹروں نے سگریٹ سے منع کیا، تو کہنے لگے کہ میں آپ کی شرائط پر نہیں، اپنی شرائط پر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ پاکستان کی سیاست اور سندھ کے حالات سے بڑے مایوس رہتے تھے۔ ان کی ایک خواہش تھی کہ اگر موقع ملے تو گاؤں میں جا کر رہا جائے اور زمین کاشت کی جائے۔ طالب علموں کے ساتھ ان کا رویہ بڑا مشفقانہ تھا، ان کی مدد کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ شام کو یا تو میں ان سے ملنے چلا جایا کرتا تھا، یا وہ آجاتے تھے اور گھنٹوں مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی تھی۔ جب میں لاہور منتقل ہوا تو ان سے خط و کتابت رہتی تھی۔ اسی دوران بیمار ہوئے اور 55 سال کی عمر میں ہی وفات پائی۔

حساس اور سوچنے والے لوگوں کے لئے یہ دنیا تنگ ہو جاتی ہے ریٹائر ہوئے، خالد وہاب صاحب سندھ کے ڈائریکٹر آف ایجوکیشن بعد میں ایم۔ کیو۔ ایم کی جانب سے انہوں نے نیشنل اسمبلی کا الیکشن لڑا، جس میں کامیاب ہوئے۔ جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا یہ آپ عملی سیاست میں کیوں آگئے؟

کہنے لگے ریٹائرمنٹ کے بعد بیکار تھا، یہ پیش کش ہوئی تو اسے قبول کر لیا۔ اکثر ان سے فون پر بات ہوتی تھی، وہ اسلام آباد اور حیدر آباد میں رہتے تھے۔ ایک رات ان سے فون پر ہی گفتگو ہوئی، صبح خبر ملی کہ انتقال کر گئے۔ حیدر آباد میں تدفین کے موقعے پر ہزار ہا لوگوں نے شرکت کی، یہ ان کی مقبولیت کی علامت تھی۔

ان صفحات میں ان دوستوں کا ذکر ہے کہ جو ایک ایک کر کے چلے گئے، ان میں سے ہر ایک کی اپنی خصوصیات تھیں۔ کردار کے لحاظ سے یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور مشکل حالات میں بھی ثابت قدم رہے۔ تاریخ میں تو ان لوگوں کا ذکر نہیں کیونکہ یہ سیدھے سادھے لوگ تھے، جنہوں نے ایمانداری سے زندگی گزاری اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی مدد کی۔ ان کے علاوہ اور بہت دوست ہیں کہ جن کا ذکر ضروری ہے ؐ گر وہ تاریخ میں جگہ نہ پائیں تو کم از کم ان صفحات میں تو ان کا ذکر ہو جائے۔

یہاں میں شکیل پٹھان کا ذکر کروں گا، جو ایک سیاسی اور سماجی کارکن تھا، میری اس سے پہلی ملاقات جرمنی سے آنے کے بعد ہوئی۔ اس کے ساتھ این۔ ایس۔ ایف کے نوجوانوں کا ایک

گروپ تھا، نایاب حسین بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اسٹڈی گروپ بنا رکھا تھا، لیکچرز کا سلسلہ تھا، میں ان کے ساتھ شامل ہوا، اور ان نوجوانوں کے ساتھ بات چیت کر کے خوشی ہوتی تھی۔

ان لیکچرز میں شریک ہونے کے لئے کراچی سے زاہد حسین، جو اب ایک مشہور صحافی ہیں، کچھ نوجوان آتے تھے۔ زاہد حسین نے اس زمانے میں ''پرچم'' کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا، جس میں میں نے مضامین لکھنا شروع کیئے۔ اس رسالہ میں، میں نے صمد بہرنگی کا مشہور افسانہ ''ماہی سیاں کو چولو'' یا ''چھوٹی کالی مچھلی'' کا ترجمہ شائع کرایا۔ یہ افسانہ جرمنی میں فارسی کے ایک سمسٹر میں پڑھایا گیا تھا۔ اس کی فارسی تہرانی ہے۔ بڑا انقلابی افسانہ ہے، جو شاہِ ایران کے عہد میں لکھا گیا۔ صمد بہرنگی کو ساواک نے اغواء کر کے قتل کر دیا تھا۔ جب ضیاء الحق کی آمریت شروع ہوئی تو شکیل اور زیادہ متحرک ہو گیا، وہ معراج محمد خاں کی پارٹی میں شامل تھا۔ ایم۔ آر۔ ڈی کی تحریک کے زمانے میں اسے بھی گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ضمیر کے ساتھ اس سے ملنے جیل گیا، یہاں ملاقاتیوں کی ایک بڑی تعداد تھی، جب شکیل آیا تو سلاخوں والی کھڑکی کے پیچھے اس سے چند باتیں کیں، پھر اچانک قیدیوں کا ایک اور ریلہ آیا اور پہلے کے قیدیوں کو کھڑکیوں سے ہٹنے پر مجبور کیا، یہی حال ہم ملاقاتیوں کا ہوا کہ دوسروں کو جگہ دینی پڑی۔

شکیل نے معافی نہیں مانگی، اور قید کی پوری مدت جیل میں گزاری۔

جب ہیومن رائٹس آف پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو شکیل کو حیدرآباد کا انچارج بنا دیا گیا۔ وہ بڑا انڈر، بے باک اور بہادر انسان تھا۔ وہ پہلا شخص تھا کہ جس نے سندھ کے وڈیروں سے ہاری قیدیوں کو رہا کرایا۔ وہ پولیس کے ہمراہ جاتا تھا اور جہاں ہاریوں کو قید رکھا جاتا تھا، انہیں چھڑا کر لاتا تھا۔ ظاہر ہے اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ وڈیروں کے لئے کسی کو قتل کرانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اسے دھمکیاں بھی ملتی رہیں، مگر اس نے پرواہ نہیں کی۔ ایک بار ایک وڈیرہ اس سے ملنے آیا اور اسے ڈیڑھ یا دو لاکھ کی پیش کش کی۔ اس نے یہ ساری گفتگو خفیہ طور پر ٹیپ کر لی۔ اس نے اس سے انکار کیا اور اس کا ٹیپ محفوظ کر لیا۔

ہاریوں کو قید سے تو چھڑوا لیا، مگر اس کے بعد مسئلہ ان کو آباد کرنے کا تھا۔ وہ اس میں بھی مشغول ہو گیا۔ میرا جب حیدرآباد جانا ہوتا، اور اس کے آفس جاتا تو وہاں ہاریوں کا جم غفیر جمع رہتا تھا۔ شکیل ان سے گفتگو میں مصروف رہتا تھا۔

لاہور سے جب بھی میں حیدر آباد جاتا تھا، تو اس کے گھر پر ہی قیام کرتا تھا۔ بڑا خیال کرتا تھا۔ اس کے ساتھ سندھ کے مختلف شہروں میں جانا ہوتا تھا، لوگ اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ وہ عمر کوٹ جا رہا تھا کہ راستے میں حادثہ پیش آیا، جس میں وہ زخمی ہوا، اور انہیں زخموں کی وجہ سے اس کا انتقال ہوا۔ اس کی وفات نے دوستوں اور احباب کو ایک پُر خلوص اور نڈر انسان سے محروم کر دیا۔ شکیل ان افراد میں سے تھا کہ جو اس معاشرے کی اصلاح میں حصہ لے رہے تھے۔ خیالات کے اعتبار سے وہ بائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا اور جہاں بھی اسے موقع ملتا تھا، اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔

حیدر آباد میں اس نے شمالی کوریا اور پاکستان کی دوستی کی ایک انجمن بھی قائم کر رکھی تھی۔ شمالی کوریا کے سفارت خانے سے کبھی کوئی آ جاتا تھا اور شکیل اس کے اعزاز میں چھوٹا سا جلسہ بھی منعقد کر لیتا تھا۔ ایک مرتبہ کراچی میں انہوں نے اپنا فنکشن کیا۔ کم۔ اِل۔ سنگ کا ایک نظریہ جو اپنی مدد آپ کا تھا اسی موضوع پر یہ کانفرنس تاج محل ہوٹل میں ہوئی۔ شکیل نے مجھ سے کہا کہ میں بھی اس موضوع پر کوئی مضمون لکھوں۔ لہٰذا میں نے ''اپنی مدد آپ'' پر ایک مضمون لکھا۔ جب ہم کراچی پہنچے تو سفارت خانے کے ایک افسر نے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرا مضمون دیکھنا چاہتا ہے۔ جب اس نے پڑھا تو میں نے دیکھا کہ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ وہ میرا مضمون لے کر اپنے بڑے افسر کے پاس گیا، اور پھر کچھ کہے بغیر میرا مضمون مجھے دیدیا۔ بعد میں، میں نے سوچا کہ آخر اس کو پریشانی کیوں تھی، تو اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آئی کہ میں نے مضمون میں کہیں بھی کم۔ اِل۔ سنگ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کا نام لینے سے پہلے کہا کرتے تھے ''عزت مآب، اور ہر دل عزیز کم۔ اِل۔ سنگ'' ___ شمالی کوریا کے سفارت خانے کے عملہ سے مل کر احساس ہوا کہ یہ لوگ خوف زدہ رہتے تھے۔ یقیناً ان کا جاسوسی ادارہ ان کی نگرانی کرتا ہوگا۔ اگرچہ سفارت خانے نے ہمیں شمالی کوریا جانے کی دعوت کا ذکر تو ضرور کیا مگر ہمیں یہ دعوت نامہ کبھی نہیں ملا۔

جب شمالی کوریا کی کانفرنس سے واپسی کا سفر شروع ہوا تو ابھی ہمارے پاس وقت تھا، لہٰذا میں نے کہا، راستہ میں زاہدہ حنا کا آفس گلشن اقبال میں ہے، ان سے ملتے ہوئے چلتے ہیں۔ ہم ان کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سبط حسن صاحب بھی آ گئے، سلام دعا ہوئی۔ ان سے میری پہلی ملاقات حیدر آباد کے ایک فنکشن میں ہوئی تھی، چونکہ اس فنکشن میں گڑبڑ ہو گئی تھی اس لئے

اس کا ذکر ضروری ہے۔ یہ فنکشن حیدر آباد کے ہوٹل فناز میں ہوا تھا، موضوع تھا ''نوجوانوں میں بے چینی کے اسباب''۔ اس میں سبطِ حسن صاحب کو بلایا گیا تھا، صدارت غلام مصطفیٰ شاہ کر رہے تھے۔ میں بھی ایک مقرر تھا، فنکشن ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ہمارے پرانے دوست ظفر حسن شاہ کا جب نمبر آیا تو انہوں نے موضوع سے ہٹ کر مضمون پڑھا کہ سندھی زبان کو کس طرح سے ظلم وستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، اور اس کی اصل وجہ اردو زبان ہے۔ ان کے بعد میرا نمبر تھا۔ میں نے کہا کہ اس طرح کی باتیں کر کے آپ کیوں لوگوں میں نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ دشمنی زبانوں کی نہیں ہوتی ہے مفادات کی ہوتی ہے۔ آپ اگر اپنے دشمنوں کو دیکھیں تو سب سے بڑے دشمن تو وڈیرے ہیں، یہ غلام مصطفیٰ شاہ بیٹھے ہیں، آپ ان کے خلاف تو کچھ نہیں کہتے کہ جنہوں نے سندھ کے کسانوں اور ہاریوں کا استحصال کر رکھا ہے۔ اس پر ہال میں ہنگامہ ہو گیا اور میرے خلاف نعرے لگنا شروع ہو گئے۔ جب سبطِ حسن صاحب تقریر کرنے آئے تو انہوں نے بھی کہا کہ اگر آپ کے مسائل کا حل اردو زبان کو ختم کرنے سے ہو جاتا ہے تو ہم آج سے اس زبان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ مگر غلام مصطفیٰ شاہ جب صدارتی تقریر کرنے آئے تو اس کا کوئی ذکر نہیں کیا اور ایک روایتی تقریر کی۔ میری اس تقریر سے ہمارے سندھی دوست بڑے ناراض ہوئے اور کہا کہ ''یہ تو آخر مہاجر''۔

اگر آپ لوگوں کے نظریات اور خیالات کی حمایت کرتے رہیں تو آپ بہت اچھے اور ہر دل عزیز ہو جاتے ہیں۔ اگر ان سے ذرا بھی مخالفت کریں تو آپ ان کی نظروں میں گر جاتے ہیں۔ مخالفت اور تنقید کو سننا ہمارے ہاں گوارا نہیں۔ لیکن میرے ساتھ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔ میں نے ہر حلقہ کی مخالفت مول لی، اور خود کو ہر دل عزیز ہونے کا موقع کھوتا رہا۔ کبھی کبھی موضوع سے متعلق شعر یاد آ جائے اور اسے لکھ بھی دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ میرا حال اس شعر کے مطابق ہے کہ ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں

سبطِ حسن صاحب سے یہ دوسری اور آخری ملاقات تھی۔ جب کراچی میں ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس ہوئی، تو ہم کراچی والوں سے قریب تھے۔ مگر اس کانفرنس میں حیدر آباد کے ادیبوں کو

دعوت نہیں دی گئی۔ یہ ضرور ہوا کہ میں اصغر علی انجینئر سے ملنے خاص طور سے کراچی گیا جہاں ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔

میں حیدر آباد ہی میں تھا، اور لطیف آباد، دس نمبر میں کرایہ کے مکان میں رہ رہا تھا۔ ایک دن آکسفورڈ انگلستان سے ایک خط آیا۔ بھیجنے والے اقبال خاں تھے، انہوں نے نہ جانے کب میری کچھ کتابوں کو پڑھ لیا تھا اور ان سے متاثر ہو کر مجھے یہ خط لکھا تھا، اس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانے اور پاکستان میں تبدیلی لانے کے لئے کام کرنا چاہیے۔ انہوں نے میرا فون نمبر مانگا تا کہ وہ پاکستان آئیں تو مجھ سے رابطہ کر سکیں۔ اس وقت تک فون کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا اس لئے میں فون سے محروم تھا، بہر حال ہمسایہ کا نمبر دے دیا۔

کچھ مہینوں بعد ہمسایہ کے ہاں اقبال خاں کا فون آیا کہ وہ کراچی آئے ہوئے ہیں اور ملنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ گلشن اقبال میں اپنے بھائی اور والدین کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا، چلو مل آتے ہیں، کراچی اور حیدر آباد میں جب سے بسیں چلنا شروع ہوئی ہیں، جانا اور آنا کافی آسان ہو گیا ہے۔ کراچی پہنچ کر ایک شام ان سے ملنے چلا گیا۔ پہلی ملاقات تھی، بڑے سنجیدہ اور متین انسان تھے۔ اپنے ساتھ میرے لئے کتابیں اور بائیں بازو کے رسالے لے کر آئے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ پاکستان واپس آ کر کام کریں۔ معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد سندھ کے رہنے والے تھے، اور سٹی کالج کے طالب علم رہ چکے تھے، یہاں سے انگریزی میں ایم۔ اے کر کے انگلستان چلے گئے، جہاں فلسفہ میں ایم۔ اے کیا، اور پھر پڑھانے لگے۔ بہاماس میں بھی رہے، ایک شادی انگریز خاتون سے کی، اور جب یہ ٹوٹی تو دوسری شادی بہاماس کی ایک خاتون سے کر لی، جس کے ساتھ اس وقت تک نباہ ہو رہا تھا۔ اس ملاقات کے بعد وہ پاکستان سے ہندوستان ہوتے ہوئے واپس چلے گئے، مگر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

انہوں نے چار کتابیں لکھیں، جو میں نے لاہور سے شائع کرائیں، آزادی کی تلاش، بھوک، پاکستان امریکہ کے چنگل میں، اور اردو اور سیکولرازم ان میں کچھ مضامین کے ترجمے تھے، کچھ انہوں نے لوگوں سے لکھوائے تھے، انگلستان سے وہ ایک انگریزی کی کتاب Fresh Perspective of Pakistan شائع کر چکے تھے۔

1988ء میں میرا انگلستان جانا ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنی آنکھوں کے بارے میں کسی ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں میرے پرانے دوست حامد زیدی کام آئے کہ جو ابتداء میں میرے ساتھ انگلستان گئے تھے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔

حامد زیدی کی شخصیت بھی دل چسپ تھی۔ وہ سندھ یونیورسٹی میں جغرافیہ کے لیکچرر تھے۔ ہم دونوں ایک ساتھ 1970ء میں انگلستان گئے۔ ان کا ارادہ پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا تھا۔ میں تو جرمنی چلا گیا وہ لندن ہی میں ٹھہرے رہے اور پی۔ ایچ۔ ڈی چھوڑ کر دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ میرا جب بھی جرمنی سے لندن آنا ہوتا تو ان کے ساتھ وقت گزرتا تھا۔ میں تو تعلیم مکمل کر کے واپس آ گیا، مگر حامد نے نہ تو تعلیم مکمل کی اور نہ واپس آئے۔ پیسہ کمانے کے گُر وہ جانتے تھے۔ اس زمانے میں یعنی 1970ء کی دہائی میں عرب سے عربوں کی بڑی تعداد انگلستان علاج کرانے یا شاپنگ کرنے آیا کرتے تھے۔ حامد زیدی نے سعودی عربیہ کے سفارت خانے کے سامنے کھڑا ہونا شروع کر دیا، اور آنے والے عربوں کو بطور گائڈ اپنی خدمات پیش کیں۔ ابتداء میں تو شاید اسے پریشانی ہوئی ہو، مگر جب عرب سیاحوں کا اعتماد حاصل ہو گیا تو اب نئے آنے والے اس کے پاس آتے۔ اس طرح اس کی واقفیت ہارلے اسٹریٹ کے تمام ڈاکٹروں سے ہو گئی۔ اس کا فائدہ مجھے بھی ہوا، کیونکہ ڈاکٹر نے میرے چیک اپ کی بہت کم فیس مجھ سے لی۔

اس عرصہ میں کامیاب زندگی گزار رہے تھے، ساؤتھ ومبلڈن میں گھر تھا اور مرسیڈیز گاڑی۔ لندن میں قیام کے دوران میں مشرف کے ہاں ٹھہرا، جو ایک اور پرانے دوست تھے۔ اقبال خاں کو آنے کی اطلاع دی، تو ان سے فون پر بات ہونے لگی پھر انہوں نے آکسفورڈ آنے کی دعوت دی۔

آکسفورڈ میں اقبال خاں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ ان کی بہاماس کی بیگم لندن میں بہاماس کے سفارت خانے میں کام کرتی تھیں۔ ویک اینڈ پر آ جاتی تھیں۔ میری ان سے ملاقات ہوئی۔ خوش اخلاق اور ہنس مکھ خاتون تھیں۔ میں دو مرتبہ آکسفورڈ ان سے ملنے گیا، اور ایک مہینہ لندن میں قیام کر کے واپس پاکستان آ گیا۔

1989ء میں جب ہم لوگ لاہور منتقل ہو گئے تو اقبال خاں کا خط آیا کہ وہ مستقل طور پر

ہندوستان میں رہائش اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں لکھا کہ اگر آپ کا مقصد لوگوں کے لئے کام کرنا ہے تو اس کے لئے پاکستان سے اچھا اور کوئی ملک نہیں، یہاں ضرورت ہے کہ لوگوں میں شعور پیدا کیا جائے۔ شاید اس خط کا اثر ہو، یا انہوں نے خود سے فیصلہ بدل دیا ہو، وہ پاکستان چلے آئے، اور جب لاہور آئے تو ہمارے ہاں ہی ٹھہرے۔ یہاں دوستوں سے ان کی ملاقات کرائی گئی۔ جب میرا تقرر گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں ہو گیا تو وہ میری جگہ مشعل کے ایڈیٹر ہو گئے جہاں انہوں نے بڑی محنت سے کام کیا۔ اس دوران انہوں نے ''ینگ تھنکرز فورم'' کے نام سے نوجوانوں کے ایک گروپ کو آرگنائز کیا۔ اس میں ندیم عمر، اسد جمال، اور سلمان عابد کے علاوہ کئی نوجوان شامل تھے۔ ان کی میٹنگ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں ہوتی تھی، جہاں یہ مختلف دانشوروں کو بلا کر ان کے لیکچرز کراتے تھے۔ وہ خود ان نوجوانوں کے لئے مضامین کے ترجمے کرتے تھے، اور انہیں لیکچرز دیتے تھے۔ ان نوجوانوں کی جو تربیت انہوں نے کی اسے آج بھی یہ یاد کرتے ہیں انہوں نے جمیل عمر کے ساتھ مل کر ایک پندرہ روزہ رسالہ ''بدلتی دنیا'' نکالا، اس کے مضامین کے لئے وہ خود بڑی محنت کرتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ رسالہ کو جب تک اشتہار نہ ملیں، اس کی قیمت بہت ہوتی ہے اور یہ قیمت وہ زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکے اور رسالہ کو بند کرنا پڑا۔

چونکہ وہ ہمارے ساتھ رہے تھے اس لئے میری بچیوں سے بہت بے تکلف ہو گئے تھے، مگر ہمیشہ خرچ کرنے کے معاملہ میں سخت کنجوس تھے۔ بچیوں کو مشکل سے عید پر عیدی دیا کرتے تھے، یا باہر کھانے کی دعوت دیں گے تو کہیں گے کہ بل میں آدھے آدھے کی شراکت ہو گئی۔ آہستہ آہستہ لاہور کی زندگی کے عادی ہو گئے تھے۔ جب لندن سے ان کی کتابیں اور فلمیں آئیں، تو وہ دوستوں کو بلا کر وہ فلمیں دکھاتے تھے، اور پھر ان پر بحث و مباحثہ کراتے تھے۔ اچھے خاصے صحت مند تھے اکیلے تھے اچانک بیمار ہوئے۔ ہم انہیں دیکھنے گئے، اس وقت وہ کرایہ کے مکان میں رہ رہے تھے۔ چونکہ اکیلے تھے، اس لئے ہم انہیں اپنے ساتھ گھر پر لے آئے۔ ایک دن میں گوئٹے سے واپس آیا، اور کمرے میں جا کر ان سے بات چیت کی۔ وہاں سے اٹھ کر لاؤنج میں ٹی۔ وی دیکھنے آیا کہ ان کے کمرے سے زور سے کھانسی کی آواز آئی۔ دوڑ کر گیا دیکھا کہ بے حس و حرکت پڑے ہوئے ہیں۔ خاموشی اور سکون سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اور معاشرے کو تبدیل کرنے کی خواہش بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے تقریباً 30 برس باہر

گزارے، وفات کے وقت ان کی عمر 60 سال کی تھی۔

ان کی وفات کا صدمہ ہمیں سب کو تھا، کیونکہ وہ ہمارے خاندان کے ایک فرد بن چکے تھے۔ ہم آج بھی ان دنوں کو یاد کرتے ہیں کہ جب وہ پاکستان آئے تھے اور بڑے ارادوں کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔ ینگ تھنکرز فورم کے لوگ نوجوانی کی حدود سے گزر کے پختہ عمر کو پہنچ گئے ہیں اور ان کی تربیت کو یاد کرتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ان میں شعور کی پختگی آئی۔

جرمنی سے واپس آنے کے بعد 1985ء میں میرا لاہور آنا ہوا تھا، ساہی جو ایک تعلیم کی انجمن ہے، اس نے لیکچر کے لئے دعوت دی تھی۔ اس سفر میں میرے ساتھ عیسیٰ داؤد پوتہ بھی تھے۔ اس لیکچرز میں لاہور کے تمام مشہور دانش ور شریک تھے، جن میں مظہر علی خاں، طاہرہ مظہر علی، صفدر میر، عبداللہ ملک، اور نصیر اے شیخ موجود تھے۔ ایک شام انہوں نے ہمیں کھانے کی دعوت دی، جب ہم کینٹ میں ان کے گھر پہنچے تو میں ان کا گھر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وسیع و عریض علاقہ میں پھیلا ہوا یہ گھر ان کی امارت کو ظاہر کرتا تھا۔ میں نے دوستوں سے کہا کہ انہیں ہم جیسے لوگوں کی دعوت کا خیال کیوں آیا؟

دوستوں نے کہا کہ اگرچہ یہ بڑے سرمایہ دار ہیں، مگر ترقی پسند خیالات رکھتے ہیں، دعوت میں بھی لاہور کی اہم شخصیات شامل تھیں۔ اس کے بعد ان سے دوستی ہوگئی، کہنے لگے جب بھی لاہور آؤ، میرے مہمان رہا کرو۔

یوں یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ لاہور آتا تو ان کے ہاں ہی ٹھہرتا تھا، وہ بڑے منطقی اور عقلیت پرست تھے۔ گفتگو بڑے دلائل کے ساتھ کرتے تھے۔ چونکہ بات چیت کا شوق تھا اس لئے دوستوں کو اکٹھا کئے رکھتے تھے۔ حیدرآباد میں بھی ان کے فون آتے رہتے تھے۔ کراچی آتے تو خواہش کرتے کہ ان سے ملاقات کروں۔ ایک مرتبہ لاہور آیا تو میرا لیکچر کرایا، جس میں اور لوگوں کے ساتھ مسعود کھدر پوش بھی تھے ان سے میری یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ چونکہ وہ سندھ میں رہے تھے اس لئے اپنے زمانے کی باتیں کرتے رہے۔

شیخ صاحب نے لیکچرز کی ایک سیریز کرائی تھی، جس کا عنوان تھا کہ ''پاکستان ایک جمہوری ملک کیوں نہیں بن سکا؟'' اگرچہ مقررین میں سیاستدان تھے، مگر کسی کی عمدہ تقریر نہ ہوسکی اور نہ موضوع کا تجزیہ ہوسکا۔ انہوں نے اس مجموعہ کو بعد میں شائع بھی کرایا تھا۔

وہ US role in Pakistan سے متاثر ہوئے، اور قاضی جاوید سے اس کا ترجمہ کرا کے اسے شائع کر دیا۔ میں نے ان کے ترقی پسندانہ خیالات کو دیکھتے ہوئے، ان سے کہا کہ شیخ صاحب آپ ایک تحقیقی ادارہ قائم کر دیں تاکہ پاکستان پر اچھا کام ہو سکے۔ وہ اس پر تیار ہوئے، فیروز پور روڈ پر ان کا آفس ہے، جس میں کافی جگہ ہے، وہاں انہوں نے تعمیر کا کام شروع کرا دیا، لائبریری، اسکالرز کے لئے بیٹھنے کی جگہ، میں حیدرآباد چلا گیا، جب دوبارہ لاہور آنا ہوا تو میں نے پوچھا کہ شیخ صاحب تحقیقی ادارے کا کام کس حد تک ہوا۔ کہنے لگے وہ جگہ میں نے کرایہ پر دیدی۔ پھر لائبریری کی علیحدہ سے کیا ضرورت ہے، لاہور میں کئی لائبریریز ہیں، وہاں کام ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا شیخ صاحب مسئلہ لائبریریز کا نہیں، ایک جگہ کا اور اس میں کام کرنے والوں کا ہوتا ہے جو ایک نظریہ اور مقصد کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

تحقیقی ادارہ بنانے کی ایک اور کوشش روشن علی بھیم جی کے ساتھ ہوئی۔ یہ کوئی 1991ء کی بات ہوگی۔ سید سبط حسن میموریل لیکچر کے لئے مجھے کراچی آنے کی دعوت ملی۔ میں نے بنیاد پرستی کے موضوع پر لیکچر دیا اس میں کراچی کے علاوہ ہندوستان کے مہمان بھی شامل تھے جن میں کیفی اعظمی بھی تھے۔ رات کا کھانا سبط حسن کی بیٹی کے گھر تھا اس میں روشن علی بھیم جی بھی تھے۔ جب ذرا بات چیت کی فضا گرم ہوئی تو بھیم جی مجھ سے کہنے لگے کہ مبارک میں نے پیسہ بہت کما لیا ہے، اب میری خواہش ہے کہ اس ملک کے لئے کچھ کیا جائے۔ میں نے کہا، ضرور، ہم اس میں آپ کے ساتھ ہیں، میری خواہش ہے کہ ایک ایسا ادارہ ہو کہ جہاں سے ذہنی تحریک کا آغاز ہو۔ لوگوں کو اس ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی معاملات پر آگہی ہو۔ اگر آپ لاہور میں جو انشورنس کی عمارت بنوا رہے ہیں، اس میں ایک حصہ اس ادارہ کو دیدیں، کہنے لگے کہ میں لاہور آ رہا ہوں، وہاں اس موضوع پر بات ہوگی۔ جب وہ لاہور آئے تو فون کیا کہ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں، رات کے کھانے پر آ جاؤ۔ جب میں ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ لاہور کے اہم ترقی پسند دوست وہاں پہلے سے موجود تھے جب تحقیقی ادارہ کی بات ہوئی تو کہنے لگے کہ سیمینار منعقد کرنے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ میں نے کہا، میں اس کا مخالف نہیں، مگر محض سیمینار کرانے سے کام نہیں بنے گا۔ اس کے بعد نہ ان سے ملاقات ہوئی اور نہ تحقیقی ادارے کے بارے میں ان کا ردِعمل سامنے آیا۔

اس سے اندازہ ہوا کہ ہمارا صنعت کار روشن خیالی میں ایک حد سے آگے نہیں بڑھتا ہے، اس کا وژن اتنا وسیع نہیں کہ سوچ سکے کہ اس کے کاروبار اور صنعت کے لئے ایک جمہوری، سیکولر اور لبرل معاشرے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا شیخ بھی صرف باتیں کرتے رہے، مگر عملی طور پر کچھ نہ کر سکے۔

بہرحال دوستی اپنی جگہ، ایک بار میں حیدرآباد سے آیا تو میں نے خواہش ظاہر کی کہ علی عباس جلالپوری صاحب سے ملا جائے، میں نے ان کی اور کتابوں کے علاوہ اقبال اور اس کا علم الکلام پڑھی، جو اقبال پر بڑی عمدہ تحریر ہے اور بہت مثبت تنقید بھی ہے۔ چنانچہ ایک دن سبط حسن ضیغم، قاضی جاوید اور شیخ صاحب کے ہمراہ جہلم گئے۔ شیخ صاحب کی بڑی ہمت تھی راستے بھر بولتے گئے۔ جہلم میں علی عباس جلالپوری سے ملاقات ہوئی، اس وقت وہ بیمار تھے اور فالج کے مریض، مگر ذہنی طور پر بالکل صحت مند۔ پاکستان کی روشن خیالی کی تحریک میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ فلسفہ کے ذریعہ انہوں نے لوگوں میں شعور اور آگہی کو پیدا کیا۔ ان سے ملاقات کے بعد جہلم کالج کے دوست کالج میں لے گئے، جہاں اساتذہ اور ان کے ساتھ طلباء سے ملاقات رہی۔

جب 1989ء میں ہم لوگ لاہور میں شفٹ ہوئے، تو انہوں نے ہمارے اعزاز میں ایک پارٹی دی، جس میں لاہور کے تمام ترقی پسند لوگوں کو بلایا۔ جب تک ہم پوری طرح سے اس ماحول کے عادی نہیں ہو گئے، انہوں نے ہمارا بڑا خیال کیا۔ کہیں آنا جانا ہوتا تو موٹر بھیج دیا کرتے تھے، بچیوں کو ابتداء میں اسکول لے جانے اور لانے کے لئے بھی وہ موٹر بھیج دیا کرتے تھے۔

وہ بڑے ڈسپلن کے آدمی تھے، ہر کام وقت پر، اور قاعدہ سے ہوتا تھا۔ گھر میں وہ اپنا وقت لائبریری میں بیٹھ کر گزارتے تھے، یہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کی لائبریری تھی جسے ایک زمانہ میں انہوں نے خرید لیا تھا۔ وہ پنجابی زبان کے زبردست حامی تھے۔ اگر کوئی فون پر اردو میں بات کرتا تو اسے ڈانٹ دیتے تھے کہ پنجابی میں کیوں بات نہیں کرتے۔

اس عرصہ میں کچھ غلط فہمیاں ہوئیں، اور ہمارا ملنا نہ رہا، کوئی چار سال بعد ایک دن فون آیا کہ ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔ میں اور قاضی جاوید ان سے ملنے گئے دیکھا کہ ان کی لائبریری کا کمرہ اب ان کے پاس نہیں ہے۔ ایک دوسرے کمرے میں ان کی نشست تھی، ایسا محسوس ہوا کہ وقت کے ساتھ وہ اپنے گھر میں بھی اپنا وہ مقام کھو چکے ہیں۔ ایک آدھ گھنٹہ یہ ملاقات رہی، اپنی خواہش

کا اظہار کیا کہ مشرقی پنجاب جا کر کچھ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں چھوڑنے باہر تک آئے، میں نے دیکھا کہ کمزور ہو گئے تھے۔ یہ ان سے ہماری آخری ملاقات تھی۔

عبداللہ ملک صاحب سے میں واقف تو اس وقت سے تھا کہ جب حیدرآباد میں تھا، ان کی اردو کتابوں میں مجھے ''پنجاب کی سیاسی تحریکیں'' اچھی لگی تھی۔ جب میری ابتدائی دو کتابیں حیدر آباد سے شائع ہوئیں تو وہ کسی نہ کسی طرح لاہور بھی پہنچ گئیں۔ لاہور سے میرے پاس عبداللہ ملک اور حمید ہاشمی کے خطوط آئے۔ جب 1985ء میں لاہور آنا ہوا تو پہلی مرتبہ ملک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بڑی شفقت اور محبت سے ملے۔ میری تحریروں کی تعریف کی، میں اور عیسیٰ ان سے ملنے، ان کے گھر گئے، دیر تک ادب اور سیاست پر گفتگو رہی۔ سندھ کی صورت حال کے بارے میں پوچھتے رہے۔ گفتگو میں بڑے ماہر اور حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس کے بعد سے ان سے رابطہ رہا، جب بھی لاہور آنا ہوتا تو ان سے ضرور ملاقات ہوتی، ان دنوں ان کے تعلقات نصیرا ے شیخ سے تھے۔ اس لئے مجلسیں بڑی گرم رہتی تھیں۔

لاہور منتقل ہونے کے بعد ان سے ملنا ہوتا رہتا تھا۔ جب بھی ان کے پاس جانا ہوتا، وہ اپنے گھر کے باہر برآمدے میں تخت پر بیٹھے ہوئے، پڑھتے یا لکھتے ہوئے ملتے تھے۔ ان کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ دوسروں پہ تنقید کرتے تھے۔ مگر خود پر بھی تنقید کو برداشت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے کہا ملک صاحب آپ کو اچھی طرح لکھنا نہیں آتا۔ کہنے لگے بھئی ہماری تربیت بحیثیت صحافی کے ہوئی، ہم محقق تو ہیں نہیں۔

انہوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں، چونکہ پاکستان میں ترقی پسند نظریات پر ادب کی کمی تھی۔ اس لئے ان کی کتابوں نے اس ضرورت کو پورا کیا۔

جلسوں میں وہ بے دھڑک اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے جناح صاحب کہہ دیا تو لوگوں نے شور مچایا کہ قائداعظم کہو، مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے اور شور وغل کی پرواہ نہیں کی۔ پنجاب کی روایتی سوسائٹی میں رہتے ہوئے انہوں نے اپنے خیالات کو نہ تو چھپایا اور نہ بدلا۔

بیماری کے زمانے میں ایک دن فون آیا کہ شام کو ملنے آجاؤ۔ اس شام اتفاق سے ایک جگہ اور دعوت تھی، میں نے کہا آج نہیں کل آجاؤں گا۔ کہنے لگے مبارک آج ہی آجاؤ تو اچھا ہے۔ یہ

ایسے لہجہ میں کہا کہ انکار نہیں کر سکا، ان سے ملنے گیا، بیمار لگتے تھے۔ کہنے لگے کہ کوئی نوجوان ہے کہ جو میرے نوائے وقت کے کالموں میں افغانستان کے بارے میں جو مضامین ہیں، انہیں اکٹھا کر دے۔ اس کام کے لئے میں دوسری مرتبہ ندیم عمر اور بلال احمد کے ساتھ گیا۔ انہوں نے اپنی لائبریری اور کالموں کے اخبارات دکھائے، بلال نے وعدہ کیا، مگر یہ کام بلال کر نہ سکا، ملک صاحب زیادہ بیمار ہوئے تو اسلام آباد چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

عزیز سندھی سے پہلی ملاقات بڑے پُراسرار انداز میں ہوئی، شاید 1986ء کی بات ہے، لاہور میں پروفیسر منظور صاحب نے تاریخ کے موضوع پر ایک سیمینار فلیٹی ہوٹل میں کرایا تھا۔ میں اس میں شرکت کے لئے حیدرآباد سے آیا تھا۔ جب سیمینار ختم ہوا تو ایک صاحب کہ جن کی ہلکی سی داڑھی تھی میرے پاس آئے اور مجھ سے حیدرآباد کا پتہ پوچھا۔ ان کو دیکھ کر میرا پہلا خیال تو یہ ہوا کہ یہ صاحب یقیناً سی۔ آئی۔ ڈی کے معلوم ہوتے ہیں، اور میرا پتہ کسی تحقیق کے سلسلہ میں لینا چاہتے ہیں، پہلے تو میں نے سوچا کہ انکار کردوں، مگر پھر سوچا کہ ان سی۔ آئی۔ ڈی والوں سے کیا چھپانا، لہٰذا میں نے اپنا پورا پتہ ان صاحب کو دیدیا۔

مجھے حیرانی اس وقت ہوئی کہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی، یہ صاحب میرے گھر پہنچ گئے اور اب اپنا پورا تعارف کرایا۔ ان کا خاندان بڑے عرصہ سے نواب شاہ کے قریب ایک گاؤں میں آباد تھا۔ انہوں نے ملتان اور کراچی کے مدارس میں تعلیم حاصل کی تھی۔ پڑھنے کا شوق تھا، جس نے انہیں مذہبی خیالات سے نکال کر ترقی پسند بنا دیا تھا۔ بڑے مہم جو اور دور رس انسان تھے۔ اپنا گاؤں چھوڑ کر لاہور آ گئے اور بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ انہیں سیاست سے محض باتوں کی حد تک دلچسپی نہیں تھی، بلکہ وہ پاکستان میں تبدیلی چاہتے تھے، اس سلسلہ میں وہ پاکستان کے تمام سیاستدانوں اور دانشوروں سے ملے۔ کچھ نے سنجیدگی سے ان کی باتیں سنیں، اور کچھ نے ان سے ملنا یا ان سے گفتگو کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ مگر وہ ہمت ہارنے والے نہیں تھے، جہاں موقع ملتا سیاستدانوں اور ان کے خیالات پر تنقید کرتے تھے۔

انگریزی نہیں جانتے تھے، مگر اردو میں جتنا بھی ترقی پسند ادب تھا انہوں نے پڑھ رکھا تھا۔ وہ صرف خود ہی نہیں پڑھتے تھے، بلکہ دوستوں کو بھی پڑھواتے تھے، میری کتابیں خرید کر سندھ میں اپنے دوستوں کو بھجوایا کرتے تھے۔ ہمارا سہ ماہی تاریخ کو کئی دوستوں کے نام لگوا دیا تھا۔ اگر چہ وہ

لاہور میں آباد ہو گئے تھے، مگر وہ پورے پاکستان میں سفر کرتے رہتے تھے اور لوگوں سے مل کر ملک اور معاشرے کی بھلائی کے بارے میں تجاویز دیا کرتے تھے۔

جب میں لاہور آ گیا تو ان سے مستقل ملاقاتیں ہوتیں۔ ایک زمانہ میں ہم دوست فکشن ہاؤس پر سنیچر کے دن ملا کرتے تھے۔ عزیز صاحب وہاں کے مستقل آنے والوں میں سے تھے۔ جب بحث و مباحثہ ہوتا تو بڑے چبھتے ہوئے سوالات کرتے تھے۔ اگر کوئی انگریزی کے الفاظ استعمال کرتا تو فوراً کہتے کہ اس کے معنی بتاؤ۔

ایک مرتبہ ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ایک مقرر نے انگریزی میں بولنا شروع کر دیا، تو عزیز صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اردو یا پنجابی میں بولیں، کیونکہ انگریزی ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ سہ ماہی تاریخ کی جانب سے ہم ہر سال ایک کانفرنس کرتے تھے، وہ ان سب میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ کراچی میں بھی جا کر شرکت کرتے تھے۔

وہ پروفیسر سرور صاحب کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتے تھے۔ سرور صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریروں کو جمع کر کے شائع کرایا تھا۔ دوسری شخصیت ڈاکٹر کمال حسین کی تھی، جو ایک ہندوستانی قوم پرست تھے اور انگریزوں کے خلاف دہشت گردوں کی تحریک میں شامل رہے تھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ڈاکٹر کمال صاحب سے ملاقات کرائیں۔ ایک مرتبہ میں کراچی گیا ہوا تھا، عزیز صاحب بھی کراچی آئے اور مجھے لے کر کمال صاحب کے گھر گئے۔ وہ کراچی کی ایک بستی میں چھوٹے سے کواٹر میں رہتے تھے، ان سے ملاقات کر کے اور بات چیت سے اندازہ ہوا کہ پڑھے لکھے اور سیاست پر عبور رکھتے ہیں۔ مگر مجھے ان کی حالت دیکھ کر دکھ ہوا، انہوں نے اپنی پوری زندگی ہندوستان کی آزادی کی خاطر صرف کی۔ ہندوستان والوں نے ان کی عزت کی اور کانگرس کی صد سالہ تقریبات پر انہیں خاص طور سے بلایا۔ مگر پاکستان میں وہ عسرت اور مفلسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ سیاست میں حصہ لینے اور مشغولیات کی وجہ سے بچوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ نہ دی۔ وہ بھی اس قابل نہ تھے کہ مالی بوجھ کو برداشت کرتے۔ میں ان سے رخصت ہوا تو، افسوس اور غم کی حالت میں، اور سوچتا رہا کہ منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔

یہ المیہ ڈاکٹر کمال حسین ہی کا نہیں ہے۔ ان جیسے اور پُر خلوص اور ایماندار لوگوں کا ہے کہ جنہوں نے اس ملک کی آزادی اور اس کی بہتری کے لئے جدوجہد کی، اور گمنامی میں زندگی گزار دی۔

عزیز صاحب کبھی کبھی سائیکل پر ٹاؤن شپ سے گھر آ جاتے تھے، جب آتے تھے تو دو چار گھنٹے سے زیادہ ٹھہرتے تھے۔ حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے اور کبھی پرانے قصے سناتے۔ اکثر پرانے قصے کئی بار سنا چکے تھے۔ سننے کے بعد میں کہتا عزیز صاحب یہ آپ پہلے بھی سنا چکے ہیں۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں جواب میں کہتا کہ آپ کے زورِ بیان کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

بعد میں لاہور کی ایسی بستی میں چلے گئے، جو شہر سے دور ہے۔ مگر وہ بسوں میں سفر کرتے اور ملنے ضرور آتے تھے۔ ہندوستان جانے کے بڑے خواہش مند تھے، مگر صرف دو یا تین شہروں میں نہیں، سارا ہندوستان دیکھنا چاہتے تھے۔ افسوس کہ اس قسم کا ویزا ملنا مشکل تھا۔

خواہش تھی کہ یہ دونوں ملک ایک ہو جائیں تو اس خطہ میں امن ہو جائے گا۔ ایک بار آسٹریلیا ہو آئے، ان کے بیٹے نے انہیں بلایا تھا، وہاں بھی انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کی بات کی۔ انگریزی نہ جانتے ہوئے بھی اکیلے خوب گھومے پھرے۔

ایک دن آئے، بیٹے کی شادی کا کارڈ تھا۔ دیکھا تو انگریزی میں تھا۔ میں نے کہا، عزیز صاحب یہ کیا ہے؟ کارڈ یا تو اردو میں ہوتا یا پنجابی میں۔ بڑے شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے اب بچوں کے آگے نہیں چلتی ہے۔ دوسرے دن خبر ملی کہ عزیز صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔

میں اب بھی انتظار کرتا ہوں کہ صبح صبح گھر کی گھنٹی بجے گی اور دروازے پر عزیز صاحب کھڑے ہوں گے، اور میں ان سے کہوں گا کہ آپ صبح صبح ہی چلے آئے وہ میری بات سنے بغیر خاموشی سے آئیں گے اور صوفے پر بیٹھ جائیں گے۔

حمزہ علوی صاحب کی تحریریں میں پڑھ چکا تھا۔ ان کے مقالوں کا جرمن زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا تھا۔ لاہور آنے کے کچھ دن بعد ہی، میں نصیرا ے شیخ کے ہاں اورینٹل اینڈ افریقن اسکول کے پروفیسر شیکل کا لیکچر سن کر گھر آیا تو دیکھا کہ حمزہ علوی صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں، انور کمال انہیں لے کر آئے تھے اور انہیں چھوڑ کر حسب معمول خود کہیں اور چلے گئے۔ حمزہ بھائی سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ سول سروس اکیڈمی میں لیکچر دینے آئے ہوئے تھے۔ انور کمال ان سے پہلے سے واقف تھے۔ انہیں میرے پاس ملانے کو لے آئے اور خود غائب ہو گئے۔ اس وقت حمزہ بھائی مانچسٹر یونیورسٹی سے ریٹائر ہو گئے تھے اور وہیں مقیم تھے۔ سال میں ایک آدھ بار پاکستان آ جاتے تھے۔ اس ملاقات کے بعد ان سے برابر رابطہ رہا۔ ان کی عادت تھی

کہ جو بھی نیا مضمون لکھتے تھے اس کی کاپیاں دوستوں کو بھیج دیتے تھے اور ان سے مشورہ لیتے تھے۔ میرے پاس بھی ان کے مضامین پہلے پوسٹ کے ذریعہ آتے تھے، جب ای میل کا سلسلہ ہوا تو اب مضامین کے آنے میں آسانی ہوگئی۔ ان کے خطوط بھی طویل اور علمی مباحث سے معمور ہوتے تھے۔ اکثر لوگ ان سے سوالات پوچھتے تھے، وہ جوابات بھی وہ دوستوں کو بھیج دیتے تھے۔ اس طرح میرے پاس ان کے مضامین اور خطوط کا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا۔

ریٹائرمنٹ اور اپنی بیگم کی وفات کے بعد وہ اکیلے رہ گئے تھے، اس لئے بالآخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مستقل پاکستان آجائیں۔ یہاں ان کے بھائی، اور دوسرے رشتہ دار تھے۔ کراچی میں وہ اپنے آبائی مکان میں رہے جو ایسٹ گارڈن میں ہے۔ پرانے زمانہ کا بنا ہوا یہ مکان بڑا خوبصورت ہے۔ اگرچہ اب اس کے اردگرد پرانے مکانوں کی جگہ نئے پلازہ بن گئے ہیں۔ مگر حمزہ بھائی کے بھائی نے اس کو اسی حالت میں اب تک باقی رکھ رکھا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد یہاں ان کے دوستوں اور مداحوں کی بڑی تعداد تھی۔ جس کی وجہ سے ان کا دل لگ گیا۔ اکثر وہ لاہور آتے، تو میرے ہاں ہی قیام کرتے تھے، اور یوں وہ ہمارے خاندان کا ایک فرد ہوگئے تھے۔ میری بیوی اور بچیوں کے ساتھ وقت گزارتے تھے، ان سے اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ ان کی پیدائش کراچی میں ہوئی تھی، مگر یہ کراچی تقسیم سے پہلے کا تھا، ایک چھوٹا اور پُرامن شہر، ان کے والد یا دادا نے ایک اسکول قائم کیا تھا، جہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کہتے تھے کہ اردو کے استاد نے ایک دن انہیں بطورِ سزا دیوار سے اس زور سے مارا کہ انہیں اردو پڑھنے سے نفرت ہوگئی۔ انٹر کے بعد وہ پونا چلے گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ بی۔اے کے بعد وہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لینے جارہے تھے کہ کسی دوست نے کہا، الٰہ آباد چھوڑ کر علی گڑھ چلتے ہیں، اس طرح وہ علی گڑھ یونیورسٹی پہنچ گئے اور وہاں سے اکنامکس میں ایم۔اے کیا۔ علی گڑھ میں ہی وہ بائیں بازو کے طالب علموں کی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے۔ ایم۔اے کے بعد ان کا ارادہ اکنامکس میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے کا تھا، شاید کچھ عرصہ انہوں نے ریزرو بنک آف انڈیا میں ملازمت کی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں آگئے اور زاہد حسین، گورنر اسٹیٹ بنک کے ساتھ مل کر کام کیا۔

پھر نہ جانے ان کے دل میں کیا آیا کہ ملازمت چھوڑ کر، اپنی بیگم کے ساتھ تنزانیہ چلے گئے

کہ جہاں بیگم کے رشتہ دار تھے۔ وہاں کچھ عرصہ کاشت کاری کی۔ کہتے تھے کہ بوھریوں کی برادری میں ملازمت کو سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے وہ تجارت کے پیشہ میں ہوتے ہیں۔ تنزانیہ سے انہوں نے لندن کا رخ کیا۔ یہاں پر ابتداء میں وہ پاکستان کے طالب علموں اور ورکرز کے ساتھ بائیں بازو کی سیاست کا حصہ بن گئے۔ اسی دوران ان کے علمی مقالے، یورپ کے مشہور جرنلز میں شائع ہوئے، جن کی وجہ سے علمی حلقوں میں ان کی شہرت ہوگئی۔ انگلستان میں انہوں نے سسک (Sussex)، لیڈز (Leeds) اور مانچسٹر یونیورسٹیوں میں پڑھایا۔ ایک مرتبہ کینیڈا کی ایک یونیورسٹی سے ان کو ملازمت کی پیش کش ہوئی، مگر ان کے بائیں بازو کے خیالات کی وجہ سے انہیں ویزا نہیں ملا۔ امریکہ کی کچھ یونیورسٹیوں میں انہیں بطورِ مہمان پروفیسر بلایا گیا۔ ایک بار ذکر کیا کہ ہالینڈ میں پروفیسر شپ کی پیش کش ہوئی، مگر ان کی بیگم وہاں جانے کو تیار نہیں ہوئیں۔

1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بائیں بازو کے خیالات بڑے مقبول تھے۔ حمزہ بھائی کے تعلقات یورپ کے اہم دانشوروں سے تھے۔ ان کے مقالات اہم علمی جرنلز میں شائع ہوتے تھے اور بحث و مباحثہ کا باعث بنتے تھے۔ ان کے ترجمے فرانسیسی، جرمن، ہسپانوی، پرتگیزی، اطالوی اور جاپانی زبانوں میں بھی ہوئے۔ انہوں نے اپنی علیحدہ کوئی کتاب نہیں لکھی، اور نہ ہی ان مقالات کو یکجا کرا کے چھاپا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے مقالات کا اردو ترجمہ ہونا چاہئے۔ جب ہم نے سہ ماہی تاریخ نکالا تو اس میں ان کے مضامین کے ترجمے چھاپے جو بعد میں ''پاکستان: ایک ریاست کا بحران'' اور ''جاگیرداری اور سامراج'' کے عنوان سے ان مقالات پر مبنی دو کتابیں شائع کیں۔ ان کے مقالوں کا مجموعہ چھاپنے کے لئے Sage اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس تیار تھے مگر ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے مقالات میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں، چونکہ یہ پرانے ہو گئے ہیں مگر وہ یہ کام نہ کر سکے اور انگریزی کتابوں کی اشاعت ہی نہیں ہو سکی۔

جب بھی حمزہ بھائی لاہور آتے، یا میں کراچی میں جاتا، تو ان سے طویل محفل رہتی تھی۔ وہ اپنے اکثر واقعات بڑی دلچسپی کے ساتھ سناتے تھے۔ علمی معاملات میں وہ بڑے صاف گو تھے اور اپنے نظریات اور خیالات کا اظہار بلا کسی جھجک کے کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے تعلقات اپنے ہم عصروں سے خراب بھی ہوئے، مثلاً رنجیت گوھا، جو سبالٹرن اسٹڈی گروپ کے

بانیوں میں ہیں، کسی علمی بحث کے دوران ایسے ناراض ہوئے کہ ان سے بات چیت بند کر دی۔
فرانسس روبن سن سے بھی ان کے اختلافات تھے۔ مشہور انتھراپولوجسٹ لیوی اسٹراؤس (Leoy Strauss) سے بھی ان کا مکالمہ ہوا۔ کہنے لگے کہ ایک مرتبہ پیرس میں سارتر سے ملاقات ہوئی، وہ میرے مقالات کا فرانسیسی ترجمہ پڑھ چکا تھا، بڑی گرم جوشی اور عزت کے ساتھ پیش آیا۔

مارکسزم پر ان کا گہرا مطالعہ تھا مگر وہ اسے بطور تجزیہ کے استعمال کرنے کے حامی تھے۔ اینگلز کے بارے میں ان کے اچھے خیالات نہیں تھے۔ وہ اس کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے کہ داس کیپٹل کی پہلی جلد میں اس نے اہم باب کا ترجمہ شامل نہیں کیا۔ جو بعد میں پینگوئن (Penguin) کے انگریزی ایڈیشن میں یہ باب شامل ہے۔

دوسرے اس نے مارکس کے تمام مسودات جرمن کمیونسٹ کاؤٹسکی کے حوالے کر دیئے، جو انہیں رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس لئے ابتدائی دور میں لوگوں کو مارکس کے پورے اور مکمل نظریات کا پتہ نہیں تھا۔ اس کی یہ تحریریں 1960ء کی دہائی میں مشرقی جرمنی سے شائع ہوئیں تو لوگوں کو مارکس کی شخصیت اور خیالات کا پتہ چلا۔

کاؤٹسکی کی کتاب Agrar Frage یا Agrarian Question کے بارے میں حمزہ بھائی کا کہنا تھا کہ اگر اس کے لئے جرمن سیکھنا پڑے تو سیکھنا چاہئے اور اس کتاب کو پڑھنا چاہئے۔ جب اس کا انگریزی ترجمہ ہوا تو اس کا تعارف حمزہ بھائی سے لکھوایا گیا۔

آخر عمر میں وہ خلافت تحریک پر کام کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے عثمانی دور کی تمام دستاویزات کو پڑھا، وہ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتے تھے کہ آخر ترکی جرمنی کے ساتھ کیوں مل گیا، جب کہ اس کے برطانیہ سے پرانے تعلقات تھے۔ ان کے مطالعہ کے نتیجہ میں اس کا ذمہ دار انور پاشا تھا اس نے جرمنی سے اتحاد کر کے پہلی جنگ عظیم میں شریک ہوا اور شکست کے نتیجہ میں پھر وہاں تبدیلی آئی۔

خلافت تحریک پر ان کا ایک مقالہ تو شائع ہوا، مگر مزید کام پورا نہ ہو سکا۔

حمزہ بھائی تحقیق کے سلسلہ میں بہت احتیاط کرتے تھے، جب تک موضوع سے متعلق تمام مواد نہ پڑھ لیں، لکھتے نہیں تھے۔ خلافت تحریک پر اردو میں جو کتابیں چھپی تھیں انہیں اکٹھا کر رہے

تھے۔ افسوس ہے کہ ان کا یہ منصوبہ ادھورا رہا۔ ورنہ خلافت تحریک پر نئے خیالات سامنے آتے۔

ان کے مضامین کا ترجمہ کرنا بڑا مشکل تھا، ایک تو اس میں نظریاتی مباحث ہوتے تھے دوسرے وہ بڑی مشکل انگریزی لکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے کہا کہ آخر آپ اس قدر پیچیدہ اور مشکل انگریزی کیوں لکھتے ہیں، تو کہنے لگے بھئی کیا کریں، ہماری تربیت ہی ایسے ہوئی ہے۔

جب ہم نے حمزہ بھائی کے مضامین ترجمہ کرانے کا فیصلہ کیا، تو انہوں نے کہا کہ اس کا معاوضہ ادا کروں گا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا، مگر کچھ دن بعد میرے نام ای میل آئی کہ چونکہ میں اس کام کی نگرانی کر رہا ہوں، لہٰذا اس کے عوض مجھے وہ ماہانہ بیس ہزار روپیہ دیں گے۔ میں نے اس پر سخت ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے انہیں لکھا کہ میرے لئے یہ خوشی کی بات ہے۔ آپ نے ایسا کیوں سوچا کہ مجھے اس کا معاوضہ دیں۔ دوستوں میں اس قسم کی باتیں تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اس کے جواب میں ان کی بڑی پُر اثر اور ایک لحاظ سے کہہ لیں کہ دل سوز ای میل ائی کہ تم جو کام کر رہے ہو، اس میں اکیلے تم کیوں تکلیف اٹھاؤ۔ تمہاری فیملی میری ہی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم پریشان ہو، اس لئے اگر میں تمہارے کام آسکتا ہوں تو تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ میں گوئٹے کی ملازمت کے بعد سے بیروزگاری کا شکار رہا ہوں، اور بس گزارا ہوتا رہا ہے۔ اس زمانہ میں مالی پریشانیاں بہت تھیں۔ اس کے بعد سے حمزہ بھائی کا یہ دستور تھا کہ جب بھی میں کراچی جاتا یا وہ لاہور آتے تو خاموشی سے میری جیب میں کبھی بیس، کبھی تیس اور کبھی پچاس ہزار ڈال دیتے تھے۔

میری بچیوں سے بہت لگاؤ تھا۔ انگلستان جا رہے تھے تو ان سے پوچھا کہ ان کے لئے کیا لائیں۔ تینوں نے پرفیوم کی فرمائش کی، جو وہ ہر ایک کے لئے لائے۔ جب عطیہ، شہلا امریکہ جا رہی تھیں، تو ہر ایک کو پانچ سو ڈالر دیئے کہ شروع میں وہاں ضرورت ہوگی۔

جب بھی لاہور آتے اور میرے گھر ٹھہرتے تو کسی قسم کی فرمائش یا تکلف کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس لئے وہ ہمارے لئے مہمان نہیں رہے تھے۔ ان کے آنے پر دوست آجاتے تھے اور ہم ان سے نئی باتیں سنا کرتے تھے۔ ایک بار ماؤزے تنگ کے بارے میں بتایا کہ اس کی تحریروں اور عملی اقدامات میں بڑا فرق تھا۔ تحریروں میں وہ روس کو خوش کرنے کی باتیں کرتا تھا، مگر کرتا وہی تھا جو چین کے حالات کے مطابق ہوتا تھا۔

پاکستان پر ان کے ایک مضمون میں انہوں نے یو۔ پی کے متوسط طبقہ کے لئے Salariat

کی اصطلاح استعمال کی، جو علمی حلقوں میں پسند کی گئی۔ وہ پنجاب کے ایک گاؤں میں آ کر رہے اور کسانوں کے بارے میں مطالعہ کیا۔ کسانوں پر ان کی تھیوری بعد میں Alavi Wolf کے نام سے مشہور ہوئی، وولف مشہور اسکالر تھا کہ جس نے کسانوں کی تحریک پر کام کیا تھا۔

میں ایک بار کراچی گیا ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے ''مبارک بھائی My exit time has come یعنی میرے جانے کا وقت آ گیا ہے۔'' بیمار تو وہ رہنے لگے تھے مگر کاموں اور بات چیت میں بالکل صحت مند تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ رات کو اپنے کمرے میں گر گئے، سر میں چوٹ آئی، اور کوما میں چلے گئے، پھر اس عالم میں خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

وہ ایک بڑے عالم اور نیک انسان تھے۔ کسی ایک فرد میں ان دو خوبیوں کا یکجا ہونا مشکل ہوتا ہے۔

یہ تاثرات ان دوستوں کے بارے میں ہیں کہ جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کی یادیں ضرور ہیں جو پاکستان میں ہوں، یا انگلستان، جرمنی اور امریکہ میں۔ یہ میری خوش قسمتی رہی ہے کہ مجھے اچھے اور پُرخلوص دوست ملے کہ جن کے سہارے زندگی بھی گزری اور وقت بھی خوشگوار رہا۔ گہرے دوستوں کی تعداد، بڑی طویل ہے، ان سب کا ذکر کرنا مشکل ہے۔ مگر ان کی دوستی پر فخر ہے۔ لاہور میں اب ہر ہفتہ کو صبح کچھ دوست مستقل طور پر نیرنگ گیلری میں ملتے ہیں، یہاں بھولے بھٹکے دوست بھی کبھی کبھی آ جاتے ہیں، وقت اچھا گزر جاتا ہے، اور پھر اگلے ہفتہ پھر سے ملنے کی امید میں ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

میرا علمی سفر

علمی سفر کی ابتداء تو ہوتی ہے، اس کی انتہا کوئی نہیں۔ جب یہ سفر شروع ہوتا ہے تو جستجو اور اشتیاق کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، تخیلات کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ وقت اور عمر کے ساتھ جاننے، اور حاصل کرنے کے شوق میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ بچپن میں جو پڑھا تھا، جوانی میں اس کی اہمیت نہیں رہتی ہے، پھر جب علم کا حصول بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ نظریات بدلتے ہیں، اور سچائی یا حقیقت تک پہنچنے کے بارے میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے جب کوئی یہ سوال پوچھتا ہے کہ آپ کا پسندیدہ مصنف کون ہے؟ یا کون سی کتاب نے سب سے زیادہ آپ کو متاثر کیا؟ تو اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ وقت کے ساتھ مصنف بدلتے رہتے ہیں، ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب آپ کے لئے علم کے دروازے کھولتی رہتی ہے، اور یوں یہ سفر جاری رہتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ بچپن میں جو پڑھا جاتا ہے، اس میں رومان ہوتا ہے جنوں، پریوں کی باتیں ہوتی ہیں کہ جو ایک دوسری دنیا میں رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ آپ کو خوشی و مسرت کے جذبات سے معمور کر دیتا ہے۔ مگر جب آپ ان کہانیوں سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آتے ہیں، تو پھر زندگی کی تلخیاں بھی ہیں تو مسرت کے لمحات بھی، اصل زندگی کے بارے میں علم انسان کو افسردہ کر دیتا ہے۔

جب سچائی کی تلاش کی جائے اور یہ آپ کو نہ ملے تو آپ اور زیادہ مایوس ہو جاتے ہیں، اور اگر آپ اپنی سچائی کو پالیں، مگر اس پر عمل کرنے والے نہ ہوں تو پھر آپ تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علم آپ کے سکون اور اطمینان کو چھین لیتا ہے۔ یہ آپ کے ذہن کو زیادہ پریشانیوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عالم سچائی کو پالیتا ہے اور اسے سکون مل جاتا ہے۔ ورنہ یہ

ایک نہ ختم ہونے والا جستجو کا سلسلہ ہے۔ یہ بھول بھلیاں ہیں کہ جس میں آدمی گم ہو جاتا ہے۔

میں نے بچپن میں جن کتابوں سے اس سفر کا آغاز کیا ان میں داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، قصہ چہار درویش اور قصہ حاتم طائی وغیرہ تھے۔ ان کتابوں کو پڑھ کر تخیل ایک دوسری دنیا میں لے جاتا تھا کہ جہاں طلسمات تھے، عمرو عیار کی زنبیل تھی، اور بھول بھلیاں تھیں کہ جن تک پہنچنا مشکل تھا۔ یہ کتابیں مجھے اس دنیا سے دور ایسی دنیاؤں میں لے جاتی تھیں کہ جہاں کی ہر چیز نئی تھی، حیران کرنے والی، اور حقیقت کی دنیا سے بہت دور۔ ان کتابوں کو پڑھ کر تخیل میں وسعت آئی، یہ احساس ہوا کہ ہمارے علاوہ بھی اور دنیائیں ہیں، زندگی میں اچھے اور برے انسان ہیں۔ اس دنیا میں انسان ہر وقت امتحان کے عالم میں رہتا ہے۔ اس سے برابر سوال پوچھے جاتے ہیں اور وہ جواب کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

اس مرحلہ سے گزر کر، تاریخی اور جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق ہوا۔ تاریخی ناولوں میں عبدالحلیم شرر اور صادق حسین صدیقی کے ناول تھے۔ اس وقت ان ناولوں کے پڑھنے کے بعد جذبہ ایمان ابھرتا تھا اور شدید خواہش ہوتی تھی کہ تلوار لے کر نکل جائیں اور کافروں کو قتل کر کے ان کے کشتوں کے پشتے لگا دیں۔ اگرچہ ان ناولوں کا ماڈل ایک ہی جیسا ہوتا تھا، مگر ہر ناول میں اپنا لطف تھا۔ ان سے زیادہ موثر اسلامی تاریخی ناول نسیم حجازی کے تھے کہ جس میں مسلمانوں کی فتوحات اور ان کی بہادری اور شجاعت کو بڑے دل نشیں پیرائے میں بیان کیا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان کے ایک ناول سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان کے پیرائے میں، میں نے بھی ایک افسانہ لکھ ڈالا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تاریخی ناولوں نے مسلمان معاشرے کو ایک خاص قسم کا تاریخی شعور دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ صرف فاتحین اور جنگ جوؤں کے کارناموں میں محدود ہو کر رہ گئی اور جہاد و کافروں کا قتال تاریخ کا اہم باب بن گیا۔

اس کے بعد جاسوسی ناولوں کا نمبر آیا۔ اس وقت تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ کئے ہوئے ناول بڑے مقبول تھے۔ انہوں نے آرتھر کونن ڈائل کے ناولوں کا ترجمہ جس میں شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن اہم کردار ہیں، ترجمہ کئے۔ جاسوسی ناول ذہن کو سسپنس میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس میں راز پر پردے پڑے ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں۔ جب تک یہ راز کھل نہ جائے، قاری کا ذہن اس کی قید میں رہتا ہے۔ اس وقت جاسوسی ناول بہت پڑھے جاتے تھے چونکہ اردو

میں اس قسم کے ناولوں کا رواج نہیں تھا اس لئے یہ انگریزی سے ترجمہ ہوتے تھے اور محلّہ کی لائبریریوں میں آ جاتے تھے۔

ان ناولوں نے پڑھنے کی عادت ڈالی۔ کتابیں لوگوں کا ذہن بناتی ہیں اگر کوئی صرف کتابوں کو پڑھ کر آگے نہیں بڑھے، تو اس کا ذہن بھی ایک جگہ ٹھہر جاتا ہے۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے ان کی سوچ ان کی ہی تاریخی اور جاسوسی ناولوں کی سوچ ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر علم کا سفر جاری رہے تو سلسلہ اس سے آگے بڑھتا ہے، اور سوچ میں بیقراری پیدا ہوتی ہے۔

جاسوسی ناول پڑھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں تجسّس پیدا ہوتا ہے اور قاری یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ آخر اصل راز کیا ہے؟ اگر اس میں مجرم کا سلسلہ ہوتا ہے تو وہ وجوہات تلاش کرتا ہے کہ جو اسے مجرم تک لے جائیں۔ اگر ناول میں جرم کے مقدمات ہوتے ہیں تو وہ وکیلوں کے دلائل سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ ناول قاری میں تحقیق اور تلاش کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

اس زمانہ میں رائیڈر ہیگر یڈ کے ناولوں کا اردو میں ترجمہ ہوا، ان میں خزانہ کی تلاش، مانٹی زیوما کی دختر، چکہ، جوز ولو قبیلہ کا حکمراں تھا اس کی داستاں، اور شی (She) جس کا ترجمہ روح کی داستان اور روح کی واپسی کے طور سے ہوا۔ بعد میں میں نے ان کے انگریزی ورژن بھی پڑھے۔ رائیڈر ہیگر یڈ کا بیٹا جنگ عظیم اول میں مارا گیا تھا، جو اس کے لئے بڑا صدمہ تھا۔ اس لئے وہ روح اور روح سے ملاقات کرنے کا یقین کرنے لگا تھا۔ شاید روح کی واپسی اسی پس منظر میں لکھا گیا ہو۔

اس کے بعد اردو کے افسانے اور ناولوں کو پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے کچھ ناول تو ہمارے نصاب میں تھے۔ اس لئے پڑھنا پڑے، ان میں زبان کی روانی اور شستگی تو ہے، مگر یہ اصلاحی ناول ہیں، ان میں کوئی جان نہیں ہے۔ مرزا ہادی رسوا کا امراؤ جان اداؔ ان کے دوسرے ناولوں کے مقابلہ میں سب سے عمدہ ہے۔ منشی پریم چند کے ناول اور افسانے ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ کفن تو آج بھی یاد کر کے دل کو ہلا دیتا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر کے بعد میرا اردو ناول اور افسانوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ حال ہی میں ایک طویل عرصہ بعد میں نے شمس الرحمان فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سرے آسماں'' پڑھا۔ اگر چہ اردو میں اب نئے لکھنے والے آ گئے ہیں، لیکن میرا

رابطہ اب فکشن سے بہت گہرا نہیں رہا۔ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ افسانہ پڑھنے کو مل جاتا ہے، کہ جس میں نئی تازگی ہوتی ہے ورنہ مجھے اردو کے لکھنے والوں میں وہ تخلیقی صلاحیت نہیں نظر آئی کہ جو دوسرے زبانوں کے لکھنے والوں میں ہے۔

جب میں نے انگریزی میں ترجمہ کئے ہوئے روسی، فرانسیسی، اور جرمن زبانوں کے ناول اور افسانے پڑھے تو یہ ایک دوسری ہی دنیا تھی جو دریافت ہوئی۔ انگریزی کا پہلا ناول جو میں نے پڑھا وہ پرل ایس بک (Perl As. Buck) کا ''گڈ ارتھ'' (Good Earth) تھا۔ لیکن ناولوں کو پڑھتے ہوئے جب میں نے دوستوفسکی کا ناول "Crime and Punishment" یعنی ''جرم وسزا'' پڑھا تو اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے اس کے دوسرے ناول اور افسانے پڑھے، اور اس کی تحریروں کے پس منظر میں اس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی زندگی کی کہانی بھی اس کے ناولوں کی طرح افسردگی اور رنج وغم سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا باپ ایک زمیندار تھا جو اپنے مزارعوں کے لئے سخت ظالم و جابر تھا۔ اس لئے ایک دن انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ اس وقت دوستوفسکی 17 یا 18 سال کا تھا۔ اس کے بعد یہ تعلیم کے لئے سینٹ پیٹرز برگ چلا آیا۔ یہاں طلباء کی سیاست میں شریک ہوا، جو زار کے خلاف تھے۔ یہ طلباء گرفتار ہوئے اور عدالت نے انہیں سزائے موت دی۔ کہتے ہیں کہ جس دن ان کو قتل کئے جانا تھا۔ عین وقت پر زار نے ان کی سزائے موت ختم کر کے انہیں 8 سال کے لئے سائبیریا بھیج دیا۔ اس قید میں اس کے کئی ساتھی سردی اور جیل کی سختیوں کی وجہ سے مر گئے۔ یہ زندہ تو رہا مگر اس نے زندہ رہنے کے لئے روحانی قوتوں کا سہارا لیا۔ جیل سے رہائی کے بعد اس کی زندگی پریشانیوں ہی میں گزری، جوا، شراب اور بے چینی کی زندگی۔ اس لئے اس کے ناولوں اور افسانوں میں اس کی جھلک ملتی ہے۔ اگرچہ اس کے عہد میں سائنس اور عقلیت کا زور تھا، مگر یہ انسان کے اندر جو جذبات وخیالات ہوتے ہیں، ان کو عقلیت پرستی پر ترجیح دیتا ہے۔ روح کی تشویش، احساسات اور دکھ ودرد کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جرم وسزا کا ہیرو جو اس صورت حال سے دوچار ہے، اس سے اس کی محبوبہ کہتی ہے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر لے، تب ہی اسے راحت وسکون ملے گا۔ آخر میں وہ ایسا ہی کرتا ہے۔

اپنے جرم یا جرائم کو تسلیم کرنا اور اس کے نتیجہ میں سکون پانا، صرف فرد کا ہی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ تو قوموں کا مسئلہ بھی ہے۔ جو جرائم کا جواز تلاش کرتی ہیں، اور اسے تسلیم کرنے سے گریز کرتی

ہیں، اس وقت سامراجی قوتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے جرائم کو مان کر، اپنے گناہوں کی تلافی کریں۔ ہمارا بھی کام ہے کہ ہم نے بنگلہ دیش کے ساتھ جو کچھ کیا، اس پر اس سے معافی مانگیں۔ اس سے جرم کا احساس ہوتا ہے اور سوچا یہ جاتا ہے کہ آئندہ ایسے جرائم کا ارتکاب نہیں کیا جائے گا۔ مگر جب جرائم کو جرائم نہیں سمجھا جائے، تو پھر ایک کے بعد دوسرا جرم سرزد ہوتا رہتا ہے، اور فرد اور قومیں انسانیت سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا مشہور ناول Notes from underground مجھے پاکستان میں نہیں ملا تھا۔ یہ لندن کی ایک کتابوں کی دکان پر ملا، اور میں نے اسی دن اسے پڑھ ڈالا۔ یہ اس کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے۔

اس کے بعد روسی فکشن سے دلچسپی ہوئی تو گوگول، چیخوف اور ترگنیف کو پڑھا۔ ٹالسٹائی کے ناولوں نے ایک طرح سے گھیر لیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اس کا ناول وار اینڈ پیس پڑھ رہا تھا تو یہ سردیوں کے دن تھے، صحن میں چاندنی بکھری ہوئی تھی، اداس اور خاموش رات کے دو اور کبھی کبھی تین بج جاتے تھے۔ صبح اٹھنے کے خیال سے ناول رکھ کر سو جاتا تھا، جب ناول ختم کیا تو اس کا اثر دل و دماغ پر تھا۔ اس ناول میں ٹالسٹائی نے تاریخ کا فلسفہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ تاریخ میں فرد کے کردار کا حامی نہیں کہ وہ انقلابی تبدیلی لے کر آتا ہے۔ ایک لیڈر یا راہنما اس جانور کی طرح ہے کہ جس کے گلے میں گھنٹی بندھی ہوتی ہے اور پورا گلہ اس کے پیچھے پیچھے ہے۔ اس میں نپولین کا کردار ابھر کر آتا ہے کہ جب اسے روس کے خلاف جنگ میں ناکامی ہوتی ہے تو وہ خود تو راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے اور اس کی فوج برف باری میں بھوکی پیاسی جگہ جگہ مردے چھوڑتے ہوئے واپس ہو رہی ہے۔ اس وقت جب کہ فوج کے پاس کھانے کو نہیں تھا۔ نپولین کو بہترین خوراک اور شراب مل رہی تھی۔ وہ خود تو حفاظت سے پیرس پہنچ گیا، مگر اس کی فوج تباہ ہو گئی۔ لیڈر اور راہنما یہ سلوک کرتے ہیں اپنی رعایا کے ساتھ یا اپنے پیروکاروں کے ساتھ۔

گورکی قدیم اور جدید کے دور کا لکھنے والا تھا۔ اس کی کتاب ماں نے بڑی تعداد میں نوجوانوں کو انقلابی بنایا۔ اس کے ناولوں اور افسانوں کے ساتھ ساتھ اس کی آپ بیتی لاجواب ہے۔ انقلاب کے بعد لینن نے اسے پیش کش کی کہ وہ حکومت میں شامل ہو جائے، مگر اس نے انکار کیا اور ایک دانشور کی طرح ریاست سے دور رہ کر اس پر تنقید کی۔

انقلاب کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ روسی لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیت شاید دم توڑ گئی۔

شولوخوف میں وہ بات کہاں۔ بعد کے ادیبوں میں بورس پیسٹرنک، ڈاکٹر ژواگو اور سولزے نت زن کے ناولوں میں پھر بھی جان ہے۔ انقلاب سے پہلے روسی فکشن میں انقلاب سے پہلے کے معاشرے کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ یہ روس کی سماجی اور ثقافتی تاریخ ہے۔ ان ناولوں کو پڑھنے کے بعد روسی نام اور روسی ماحول سے اس قدر رومانیت ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم خود اس کا ایک حصہ ہیں۔

روسی فکشن کے بعد فرانس کے ادیبوں کی تحریریں پڑھیں، وکٹر ہیوگو کا لے مزا ابل (Le Miserable) کا بھی یہی حال ہے کہ پڑھنا شروع کرو تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ قانون کی اس جنگ میں بالآخر قانون ہار جاتا ہے۔ اس کا دوسرا ناول Hunch back of Notredame محبت کے جذبات کی تصویر ہے۔ وکٹر ہیوگو فرانس کے ایک ایسے دور میں پیدا ہوا تھا کہ جو انقلابات اور عوامی جدوجہد کا دور تھا۔ پیرس کے عوام فوج کا مقابلہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس کے ناولوں میں اس کے عوام کے نظریات اور تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔

بالزاک ان ناول نگاروں میں سے تھا کہ جو سولہ سولہ گھنٹے متواتر لکھا کرتا تھا، اور رات کو جاگنے کی خاطر تیس کے قریب کافی کے کپ پی جاتا تھا۔ اس لئے اس کی تحریریں تو بہت ہیں، مگر اس کا ناول بڈھا گوریو جس کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اس کا شاہکار ہے۔ اس ناول میں اس نے فرانس کے بورژوا طبقے کی حالت پر لکھا ہے کہ جہاں عزت و وقار کا معیار دولت ہو گئی تھی۔ چاہے اسے کسی بھی طرح سے حاصل کیا جائے۔ گوریو کی بیٹیاں اپنے باپ سے پیسہ لے کر اسے کپڑوں اور نفیس گاڑیوں کے استعمال پر خرچ کرتی ہیں تاکہ سماج میں ان کی عزت ہو۔ بورژوا طبقہ کے دیوالیہ پن پر اس کا بھرپور طنز ہے۔

گستاؤ فلوبیر کی مادام بواری میں بھی سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے کہ جس کا شکار مادام بواری ہو جاتی ہے۔ الکزنڈر ڈیوما کے ناول دلچسپ ہیں۔ میں نے Three Musketeers سے لے کر اس کی تمام سیریز پڑھیں۔

امیلا زولا (Emilazola) اور ''وان گوگ'' دونوں نے کان کنوں کی زندگی کا مشاہدہ کیا تھا۔ امیلا زولا نے ناول ''نانان'' اور جرمینیل (Germinale) لکھے جو فرانسیسی اور یورپ کے سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ جو مفلسی اور محرومیوں کی ایک داستان ہے۔ فان گوگ نے

اپنی پینٹنگز میں ان کی حالتِ زار کو پینٹ کیا ہے۔ان کی مشہور پینٹنگ (Patato Featers) ان میں سے ایک ہے۔انیسویں صدی کے فرانسیسی ادیب اور آرٹسٹ مل کر سماج میں روشن خیالی کی تحریک میں شریک تھے۔اس کے علاوہ ''اسٹنٹ ہال'' کا ناول "Black and Red" ''مذہبی رہنماؤں اور فوج کے کردار کی عکاسی کرتا ہے۔سارتر، کامیو کے ناول اور افسانے وجودیت کے فلسفے کا اظہار ہیں جو دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کے ذہنی انتشار کو بیان کرتا ہے۔

انگریزی ناولوں میں چارلس ڈکنس ، برونٹے سسٹرز، آسکر وائلڈ، جیمس جوائس، ہنری لارنس، اور دوسرے ناول نگاروں کو پڑھا، مگر مجھے ان سب میں ٹامس ہارڈی پسند ہے۔گوئٹے کا فاؤسٹ پہلے انگریزی میں اور بعد میں جرمن میں پڑھا۔جرمن ناول نگار، ناول بھی فلسفہ کی مانند لکھتے ہیں، ان میں ٹامس من، ہرمن ہیسے، ہائنرش بول، گنتر گراس کو پڑھا۔

امریکی ناول نگاروں میں ہیمنگ وے اور فاکنر کو پڑھا۔ڈراموں میں شیکسپیئر تو کورس میں تھا، اس لئے اسے پڑھنا پڑا، برنارڈ شا غضب کا ڈرامہ نگار ہے۔برتولڈ بریخت کے ڈرامے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے لئے ہی لکھے گئے ہیں۔میں نے اس کے چند افسانے اور ایک ڈرامہ ترجمہ کیا ہے۔

بریخت اس لئے ہمارے لئے اہم ہے کیونکہ وہ فاشزم کے لئے لڑا ہے، اور اس کی تحریروں کا مقصد عام لوگوں میں شعور پیدا کرنا ہے۔اس نے شاعری بھی کی، مضامین بھی لکھے، اور افسانے وڈرامے بھی تحریر کئے۔نازی حکومت کے دوران اس نے جرمنی کو چھوڑ دیا تھا۔جنگ کے خاتمہ پر اسے اتحادیوں نے مغربی جرمنی نہیں آنے دیا، اس لئے وہ مشرقی جرمنی میں مقیم رہا۔

کچھ ناول سیاسی اتار چڑھاؤ کی عکاسی کرتے ہیں، کپلنگ کا ناول کم (Kim) اس کے امپیریل ازم کے خیالات کی عکاسی ہے، یہ وائٹ مینز برڈن (White man's Burden) کی تھیوری دیتا ہے کہ جس کا مشن ہے کہ وہ غیر مہذب ایشیا وافریقہ کی اقوام کو مہذب بنائے۔لیکن اس کے برعکس جوزف کون راڈ کے ناول Heart of Darkness اور Lord Jim امپیریل ازم کے تباہ کن اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔اچے بے کا ناول Thing Fall Apart جس کا اردو ترجمہ ''بکھرتی دنیا'' کے نام سے ہوا ہے، بڑے فن کارانہ انداز میں سماجی تبدیلیوں کا اشارہ کرتا ہے جو امپیریل ازم کے نتیجہ میں ہوئیں۔

فکشن نہ صرف انسانی ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ بلکہ اس سے سماج کے اندر جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ میں نے فکشن کو پڑھ کر تاریخ کو سمجھا، تاریخ جو محض واقعات کی اسیر ہوتی ہے، وہ فکشن کا مقابلہ نہیں کرسکتی کہ جو انسان کی گہرائیوں میں جا کر ان کا مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن اگر دونوں کا ملاپ ہو جائے تو انسان اور معاشرہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔

تاریخ کا مضمون ہمارے ہاں اسکول کے نصاب سے لے کر کالج تک نصاب میں شامل ہے۔ لیکن یہ تاریخ انتہائی سپاٹ اور خشک مضمون ہے، اس وجہ سے طالب علموں میں یہ مقبول نہیں، اور سب کو ایک ہی شکایت ہے کہ اس میں سنہ اور تاریخوں کو یاد کرایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ صرف سیاست تک محدود ہے، دوسرے خاندانی حکمرانوں کے تذکرے ہیں۔ لہٰذا تاریخ میں جنگوں کے حالات، انتظامی امور کی تفصیلات، اور دربار کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ امتحان میں آج تک ایک ہی قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ سلاطین کے حکمرانوں میں کس کو اصل بانی قرار دیا جائے۔ اکبر مغل خاندان کا اصل بانی تھا، وغیرہ۔ ظاہر ہے اس قسم کی تاریخ سے نہ تو کچھ سیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی کو دلچسپی ہوسکتی ہے۔

جب میں نے تاریخ کے مضمون کا امتحان میں پاس ہونے کے بعد مطالعہ کیا اور تاریخ نویسی اور فلسفہ تاریخ کے بارے میں پڑھا تو اس مضمون کی اصل حقیقت سامنے آئی۔ برصغیر ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں متضاد خیالات اور نظریات اس لئے پیدا ہوئے کہ اس کے لکھنے والوں کا تعلق خاص حالات سے تھا۔ مثلاً جب ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انہوں نے ہندوستان کی تاریخ کو یا تو ہندوستانیوں سے لکھوایا، اور یا خود انگریز مورخوں نے کولونیل نقطہ نظر سے تاریخ لکھی۔ غلام حسین طباطبائی کی سیر المتاخرین انگریزوں کے ایماء پر لکھی گئی، اسی طرح ٹاڈ (Tod)، ڈف (Duf) اور کننگھم (Canningham) نے راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں کی تاریخ لکھی۔ جیمس مِل (James Mill) نے انگریزی ہندوستان کی تاریخ لکھی جس میں اس نے تاریخ کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کر دیا۔ قدیم ہندوستان کو ہندو عہد سے تعبیر کیا، عہد وسطیٰ کو مسلمانوں کا دورِ حکومت اور جدید ہندوستان کو برطانوی عہد کہا۔ رومیلا تھاپر نے ہندو عہد پر تنقید کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ اس پورے دور کو ہندو کہنا غلط ہے، کیونکہ اس میں بدھ حکمرانوں کا خاصا طویل عرصہ حکومت میں رہا ہے۔ یہی صورتِ حال مسلمانوں کے عہد میں تھی، کہ اس میں

ہندو راجاؤں کی ریاستیں تھیں۔

برطانوی مورخین نے اپنی حکومت کے جواز میں اس نظریہ کو بھی دہرایا کہ ہندوستان ہمیشہ سے غیر ملکی حکمرانوں کے ماتحت رہا ہے، اس لئے ان کی حکومت بھی اس کا ایک تسلسل ہے۔ لٰہذا وہ ہندوستانیوں کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے کہ وہ حکومت کرنے کے قابل ہیں۔ ان موضوعات پر میں نے اپنی کتاب ''تاریخ شناسی'' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

کولونیل نقطۂ نظر کے جواب میں ہندوستانی مورخوں نے قوم پرستی کے نقطۂ نظر سے تاریخ لکھی۔ اس کا مرکز الٰہ آباد یونیورسٹی کا شعبۂ تاریخ تھا۔ اس میں انہوں نے خاص طور سے مغل عہد کا انتخاب کیا کہ جس میں ہندو اور مسلمانوں نے مشترک تہذیب کو پیدا کیا تھا۔ 1917ء کی دہائی میں سیاست میں تبدیلی کی وجہ سے تاریخ نویسی میں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر آیا۔ جس میں ہندو مسلم اتحاد اور اشتراک کے بجائے ان دونوں کے درمیان کش مکش اور تضادات کو ابھارا گیا۔

برصغیر ہندوستان کی تقسیم کے بعد، پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ نویسی میں تبدیلی آ گئی۔ پاکستان کے مورخین کی جانب سے دو کوششیں ہوئیں، اول تو یہ کہ موجودہ پاکستان کا ہندوستان سے تعلق نہیں، دوسرا دو قومی نظریہ کی تبلیغ کی گئی۔ اس نے پاکستان کی تاریخ نویسی کو محدود کر دیا۔ میں نے جب آئی۔ ایچ قریشی کی کتابوں کو پڑھا تو ایسا محسوس ہوا کہ انہوں نے اپنے نظریہ کو درست ثابت کرنے کی غرض سے واقعات کو مسخ کیا ہے۔ یہی صورت حال ایس۔ ایم اکرام اور معین الحق کے ہاں ہے۔ چونکہ انہیں حکومت کی سرپرستی تھی، یونیورسٹیوں میں ان کا تسلط تھا، اس لئے کوئی مخالف نقطۂ نظر پیدا نہیں ہو سکا۔ بعد میں احمد حسن دانی نے تو بالکل حکومت کی کاسہ لیسی کی، اور تاریخ کے مضمون کو ختم کر کے رکھ دیا۔

اس کے برعکس ہندوستان میں مورخین جلد ہی تقسیم کے دائرہ سے نکل گئے اور تاریخ کو کئی نقطہ ہائے نظر سے لکھا جن میں قوم پرستی، مارکس ازم، اور سبالٹرن قابل ذکر ہیں۔ ان مختلف نظریات کی وجہ سے ہندوستان میں تاریخ کا مضمون بے انتہا مقبول ہے۔

ہندوستانی مورخین نے کولونیل دور پر زبردست تنقید کی ہے، جب کہ پاکستان میں اس عہد کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ میں نے جرمنی میں رہ کر کیا۔ جرمنوں کو نہ صرف اسلام بلکہ

ہندوستان اور چین کے کلاسیکل پیرڈ سے دلچسپی ہے۔اس لئے ان کی تقریباً ہر یونیورسٹی میں ان کے شعبہ ہیں۔ اسلامی تاریخ اور مذہب پر جرمن اسکالرز نے بڑی ریسرچ کی ہے، عربی کے مسودات کو تصحیح کے بعد شائع کیا ہے، اور کلاسیکل عہد پر تحقیق کی ہے چونکہ بنیادی ماخذوں کو پڑھنے کے لئے عربی، فارسی، عبرانی اور آرامی زبانوں کا جاننا ضروری ہے۔ وہ اسلام پر تحقیق کرنے سے پہلے ان زبانوں کو سیکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عربی کے بعد اسلام پر سب سے زیادہ کتابیں جرمن زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک جرمن اسکالر بروکل مان (Brookalmann) کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے دنیا بھر کی لائبریریوں میں موجود عربی مخطوطات کی فہرست معہ ان کے مضامین کی تفصیل کے ساتھ شائع کی ہے۔ میرے پروفیسر ہیر برٹ بوسے (Heribert Buse) عربی کے عالم تھے اور انہوں نے آل بویہ اور محکمہ دیوان پر تحقیق کی ہے۔

جب میں نے ایڈورڈ سعید کی کتاب اورینٹل ازم پڑھی، تو اس سے متاثر ہوا۔ مگر اس سے انکار نہیں کہ مستشرقین کی تحقیق سیاست، مذہب، اور تجارت کے مفادات کے تحت ہوئی ہو، مگر انہوں نے اپنی تحقیق سے تاریخ کے نئے موضوعات کو چنا اور اس کا دائرہ وسیع کیا۔ اس کے علاوہ ان کی تحقیق انتہائی معیاری ہے۔ جس کی وجہ سے اس علم پر ان کا تسلط ہے۔ اب ہم اپنے بارے میں سیکھنے کے لئے یورپ اور امریکہ جاتے ہیں اور اپنا چہرہ ان کے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ جب تک ہم خود اپنا علم پیدا نہیں کریں گے ہم ذہنی طور پر مفلوج ہی رہیں گے۔

تاریخ کے مضمون میں میری دلچسپی اس وقت اور زیادہ ہوئی، جب میں نے فلسفہ تاریخ پر پڑھنا شروع کیا۔ اس کی وجہ سے تاریخ میں ہونے والے واقعات اور ان کی اہمیت کا احساس ہوا اور یہ کہ ان واقعات کا سماج پر کیا اثر ہوتا ہے۔ تاریخ میں ایک اہم موضوع قوموں کا عروج و زوال ہے یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کے پس منظر میں کیا محرکات ہوتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جو تاریخ میں واقعات کے مطالعہ کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت کہ جب ہمارا معاشرہ زوال کی حالت میں ہو تو یہ سوالات اور زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ زوال کے اس پس منظر میں عام لوگوں کی رائے کی بھی اہمیت ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے زوال کی اصل وجہ ہماری نا اتفاقی اور فرقہ واریت ہے۔ اگر ہم متحد ہو جائیں تو تمام مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے، یا لوگ معاشرے کی بدحالی خود غرضی، نفسا نفسی، بدعنوانی اور بے ایمانی میں دیکھتے ہیں، اور اس خواہش کا اظہار کرتے

ہیں کہ اگر ان خرابیوں کو دور کر دیا جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ خرابیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ ان کی وجوہات کیا ہیں؟

یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کا جواب تاریخ کے مفکرین نے دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں میرا پہلا اتفاق آرنلڈ ٹوائن بی کو پڑھنے کا ہوا۔ 1960ء کی دہائی میں انگریزی کی کتابیں مسلسل آتی تھیں۔ پینگوئن اور دوسرے اداروں کی کتابیں باآسانی مل جاتی تھیں۔ ٹوائن بی کی A Study of History کی گیارہ جلدیں ادبیات حد جو تلک چاڑی کی دکان پر تھیں۔ میں ہر مہینے ایک جلد خریدتا تھا، اس طرح اس کی تحریروں سے واقف ہوا۔ اس کے بعد اوسوالڈ اشپنگلر کی کتاب ''زوال مغرب'' پڑھی، اور پھر اس سلسلہ میں ابن خلدون کو پڑھا۔

ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ کے طالب علموں کے لئے ضروری مطالعہ ہے۔ مگر یہ ہمارے نصاب کا حصہ نہیں تھا اور نہ شاید اب ہے۔ ابن خلدون ایک عرصہ تک گمنامی میں رہا اور اس کے مقدمہ کی اہمیت سے لوگ ناواقف رہے۔ یہ 19 ویں صدی کی بات ہے کہ جب عثمانی سلطنت روبہ زوال تھی تو ترکی کے دانشوروں نے ابن خلدون کو دریافت کیا تا کہ اس کے مطالعہ کے بعد وہ اپنے معاشرے کے زوال کے اسباب کو سمجھ سکیں۔ ترکی کی اس دریافت کے بعد اہل یورپ اس سے واقف ہوئے اور اس کا یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ انگریزی میں اس کا سب سے عمدہ ترجمہ روزن تھال (Rozanthal) کا ہے۔ اس نے ان تمام علماء اور اہم لوگوں کی زندگی کے حالات فٹ نوٹس میں دیئے ہیں کہ جن کا ذکر مقدمہ میں آیا ہے۔

اس کے بعد میں نے دوسرے مفکرین کو پڑھا اور تاریخ، فلسفہ تاریخ میں ان پر میرے مضامین شامل ہیں۔ یورپ میں تاریخ نویسی میں اس وقت اور تبدیلی آئی، جب عوامی تاریخ کا سلسلہ شروع ہوا۔ انالز (Annales) اسکول نے تاریخ کو اور زیادہ وسعت دی جب کہ انہوں نے روزمرہ کی زندگی اور انسانی جذبات کی تاریخ لکھی۔ تحریک نسواں نے تاریخ میں عورتوں کے کردار کو ابھارا۔

میں نے جب مارکس کا مطالعہ کیا تو اس نے میرے تاریخی نظریات میں مزید اضافہ کیا۔

ہیگل نے 1920ء کی دہائی میں تاریخ پر جو لیکچرز دیئے تھے، انہوں نے فلسفہء تاریخ میں اور اضافہ کیا۔ اس کے بعد ہرڈر، اور نیتشے نے بھی تاریخ کے فلسفہ پر لکھا، میں نے ان سب کے

نظریات پر جو مضامین لکھے ہیں، وہ اردوداں طبقے کے لئے شاید نئے ہوں۔اس کے علاوہ تاریخ کے بدلتے نظریات اور دوسری کتابوں میں میں نے تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھا ہے۔اس کے علاوہ میری یہ کوشش بھی رہی ہے کہ تاریخ کے موضوعات پر جونئی کتابیں آ رہی ہیں ان پر تبصرے کر کے ان کے نظریات کو ابھارا جائے۔ میں نے تاریخ اور تحقیق اور تحقیق کے نئے رجحانات میں ان مضامین کو شامل کیا ہے۔

جرمنی میں تاریخ کے مضمون کو بڑی اہمیت ملی، اس کی وجہ یہ تھی کہ 1870ء سے پہلے جرمنی ایک نہ تھا اس لئے جرمنی کے دانشوروں نے تاریخ اور زبان کے ذریعہ جرمن قوم پرستی کی تخلیق کی۔ ان کے لئے ریاست کا عہدہ بڑا مقدس تھا اس لئے جب لیوپولڈ رانکے (Leopold Ranke) نے تاریخ کی تحقیق کے نئے اصول اور ضوابط تخلیق کئے تو ان میں سے اہم سوال یہ تھا کہ مورخ کو اسی طرح سے واقعہ کی رپورٹ کرنی چاہئے جیسا کہ وہ ہوا ہے۔ دوسرے اس نے ریاست کی دستاویزات کی بنیاد پر لکھی تاریخ کو صحیح اور درست تاریخ کہا۔ لیکن آگے چل کر جرمن اور یورپ کے مورخوں نے اس کو چیلنج کیا۔ جب عوامی تاریخ کو لکھنے کا سوال آیا تو اس میں ریاست کی دستاویزات خاموش تھیں، اس لئے مورخوں نے دوسری دستاویزات پر بھروسہ کیا جن میں عدالت کی کارروائیاں، ریونیو کے کاغذات، سی آئی ڈی کی رپورٹس وغیرہ۔اس نے تاریخ کے موضوع کو اور زیادہ وسعت دیدی۔

تاریخ کے موضوع کو سمجھنے کے لئے میرے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ میں یورپ کی دانشورانہ تحریکوں کا مطالعہ کروں مثلاً جب انگلستان میں ہونے والے صنعتی انقلاب کا مطالعہ کیا تو اس کے پس منظر میں ہونے والی دانشورانہ تحریکوں کو بھی پڑھا، آدم اسمتھ، ڈیوڈ ریکارڈو، اور مالتھوس کے نظریات کہ جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو استحکام دیا۔اس انقلاب نے معاشرہ میں اونچ اور نیچ کو پیدا کیا۔ امیر وغریب کے درمیان فرق کو ابھارا۔ اس کے مقابلہ میں فرانس کے انقلاب نے مساوات کو پیدا کیا، اس کو تقویت ملی روسو کے نظریات سے۔

یورپ میں روشن خیالی کی تحریک نے، معاشرہ میں ذہنی اور سیاسی تبدیلیاں کیں۔ سولہویں صدی میں فرانسس بیکن نے Inductive logic کا نظریہ پیش کیا جن میں ایک خاص موضوع سے عمومی موضوع تک جا کر نظریہ کو سمجھا جائے۔

رہے۔ ڈیکارٹ نے Detuctive logic کی بات کی، جس میں عمومی سے خاص تک تحقیق کی جاتی ہے۔ اس کے بعد نیوٹن کا سائنسی انقلاب ہے، اور پھر روشن خیالی کی تحریک کہ جس میں حقیقت یا سچائی کو جاننے کا ذریعہ سائنس اور عقلیت پرستی ہو گئی، مذہب نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ دنیا برابر ترقی کر رہی ہے اور آگے کی جانب جا رہی ہے۔ اس نے یورپ کے معاشرے کا ذہن بدلا۔ آگے چل کر سائنس اور عقلیت کو چیلنج کرتے ہوئے رومانوی نقطۂ نظر نے جذبات کے کردار کو ابھارا۔ اسی تحریک نے یورپ میں مختلف نظریات کو پیدا کیا جن میں قوم پرستی، تحریکِ نسواں، ثبوتیت پسندی (Positiversion)، سوشل ازم اور مارکس ازم۔

ڈارون نے نظریہ ارتقاء پیش کر کے مذہبی عقائد پر زبردست حملہ کیا لیکن ڈارون کے نظریہ سے سوشل ڈارون ازم نکلا، جس نے نسل پرستی، اور امپیریل ازم کو پیدا کیا۔ اس کے ذریعہ یہ ثابت کیا گیا کہ طاقت ور اور توانا قوموں کو زندہ رہنے اور کمزوروں پر حکومت کرنے کا حق ہے۔

یہ نظریات ہمارے ہاں بھی آئے اور تاریخ نویسی ان سے متاثر ہوئی، ہندوستان میں کوسمبی نے مارکسی نقطۂ نظر سے قدیم ہندوستان کی تاریخ کی تفسیر کی، ان کے کام کو رومیلا تھاپر اور ایس۔ آر شرما نے آگے بڑھایا۔ عرفان حبیب اور علی گڑھ اسکول نے عہد وسطیٰ کی تاریخ کو مارکسی انداز میں پیش کیا۔ سبالٹرن مورخوں نے جن میں سمت سرکار گیان پانڈے اور شاہد امین وغیرہ ہیں انہوں نے جدید تاریخ کو ترقی پسند نقطۂ نظر سے پیش کیا۔

ہربنس مکھیا نے مغل تاریخ کو ایک نئے اور تازہ انداز میں ترقی پسندی کے رجحانات کے ساتھ لکھا۔ اس لئے ان نظریات نے ہندوستان کی تاریخ کو بھی نئی تازگی دی۔

تاریخ کے سمجھنے میں آثارِ قدیمہ کی دریافتوں اور پھر ان کی بنیاد پر ماضی کی تشکیل نے اس کو نہ صرف وسعت دی بلکہ ماضی کی اس اَن جان دنیا سے روشناس کرایا کہ جو صدیوں سے زمین میں مدفون نظروں سے اوجھل تھی۔ یہ انسان کا کھویا ہوا ماضی تھا کہ جسے دریافت کیا گیا۔ اس دریافت نے حیرت انگیز انکشافات کیے کہ ماضی کے بارے میں جو ہمارے مفروضے تھے کہ وہ پس ماندہ اور ذہنی طور پر ہم سے بہت پیچھے ہیں، غلط ثابت ہوئے۔ آثارِ قدیمہ کی دریافتوں نے انکشافات کیے، ایسے انکشافات کہ آج کا جدید انسان ان کی دریافت سے ششدر رہ جاتا ہے۔ مثلاً مصر میں ممی کرنے کا فن، یہ ایسا علم تھا کہ جو ان کے ساتھ ہی روپوش ہو گیا۔ اب ماہرین اس کوشش میں ہیں

کہ تجربات کے بعد دوبارہ سے اسے حاصل کیا جائے۔ اس لئے آثارِ قدیمہ کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ انسان کی کھوئی ہوئی تاریخ یا علم کو دوبارہ سے واپس لا رہا ہے اور اس ماضی کی تشکیل کر رہا ہے کہ جو کھو دیا تھا اور جسے ہم بھول چکے تھے۔

جیسے جیسے نئے آثار دریافت ہو رہے ہیں، علم آثارِ قدیمہ کا دائرہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ اب اس کو کئی قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مثلاً پانی کے اندر دریافت کرنے والا علم (Under Water Archaeology)، کوڑا کرکٹ سے ماضی کے بارے میں معلومات کرنے والے۔ باغوں کے بارے میں علم، جن کے ذریعہ قدیم عہد کے درخت، پودے اور بیجوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا، میدان جنگ کے آثاروں کو دریافت کر کے فوجیوں کے ہتھیار اور ان کے لباس وغذا کے بارے میں دریافت، ٹیکنالوجی کے ماہرین، جو ماضی کی ٹیکنالوجی اور ایجادات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسانوں اور جانوروں کی ہڈیوں سے ان کی حرکات اور کاموں کے بارے میں علم اکٹھا کرنا۔

وقت کے ساتھ یہ علم انتہائی حساس ہو گیا ہے۔ اب کھدائی کے لئے نئے اوزار اور آلات ہیں، ملنے والی چیزوں کو ماہرانہ انداز میں محفوظ کرنے کا فن ہے۔ جب مصر اور میسوپوٹامیہ کے رسم الخط پڑھے جانے لگے تو تہذیبوں کی کہانی بیان کی جانے لگی۔ اب ان کی مدد سے قدیم عہد کے معاشروں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی کے بارے میں پوری تصویر سامنے آ گئی۔

آثارِ قدیمہ کے علم میں اس وقت اور تبدیلی آئی کہ جب اس پر زور دیا گیا کہ محض اوزار، ہتھیار اور استعمال شدہ اشیاء کی دریافت کافی نہیں ہے، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ ان کو استعمال کیسے کیا جاتا تھا، اور لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کیا تھی؟

ابتداء میں جو آثار دریافت ہوئے اور وہاں سے جو اشیاء ملیں انہیں بادشاہوں یا امراء نے لے لیا اور ماضی کی قیمتی اشیاء کا جمع کرنے کا شوق ہوا، کہ جن میں مجسمے، ہتھیار، اوزار، زیورات اور دوسری اشیاء شامل تھیں۔ بعد میں میوزیم کا قیام عمل میں آیا اور ان اشیاء کی وہاں نمائش ہونے لگی تاکہ عام لوگ بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔ موجودہ دور میں اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ جو اشیاء جہاں سے ملتی ہیں، انہیں وہیں رہنے دیا جائے اس لئے ان مقامات پر اپنے میوزیم ہیں، جہاں

دریافت ہونے والی اشیاء کو رکھا جاتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اکثر آثاروں کی دریافت حادثاتی طور پر ہوتی ہے۔ کبھی کنواں کھودتے وقت، کبھی کھیت میں ہل چلاتے ہوئے، اور کبھی کسی عمارت کی بنیاد کھودتے ہوئے اور کبھی سڑک کی تعمیر کے وقت۔ مثلاً اس فن کی باقاعدہ ابتداء اور پیشہ ورانہ طور پر آثار کی دریافت کو 1730ء کی تاریخ دی جاسکتی ہے جب نیپلز کے ایک گاؤں میں کنواں کھودتے ہوئے ایک رومی شہر کی دریافت ہوئی، یہ شہر (Herkilanium) ہرکی لے نیم تھا جب کھدائی ہوئی تو شہر کے آثار دریافت ہوئے۔ یہ شہر آتش فشاں پہاڑ کے لاوے میں آ کر تباہ ہو گیا تھا۔ اس کی کھدائی کرنے والا ایک انجینئر تھا، جس نے انتہائی احتیاط سے کھدائی کی، اور جو اشیاء یہاں سے ملیں ان کی مکمل فہرست تیار کی۔

اس کے بعد، دوسرا شہر جو ہرکی لے نیم کے ساتھ دریافت ہوا وہ پومپے (Pompay) تھا۔ یہ بھی آتش فشاں پہاڑ کے لاوے میں دب گیا تھا۔ شہر کی دریافت نے نئی معلومات فراہم کیں، کیونکہ لاوے کی تیز رفتاری کی وجہ سے شہر تباہ ہوا، اس لئے جو جہاں تھا وہیں اس میں مدفون ہو گیا۔ شہر کے بازار، دکانیں، گھر، گھروں میں کام کرتے ہوئے لوگ۔ ایسا محسوس ہوا کہ شہر کی زندگی تھم گئی اور وہ بے حس اور بے جان ہو کر ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی۔ اس شہر نے ماہرِ آثارِ قدیمہ کے فن میں بھی اضافہ کیا۔ انہوں نے برتنوں، اوزاروں، گھریلو استعمال کی اشیاء، امراء اور عام لوگوں کے گھروں، اور دوسرے مختلف طبقوں کی طرزِ رہائش، ان سب کی تشکیل کی۔ شہر کی شاہراہیں اور سڑکیں، پبلک عمارتیں جن میں مندر خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان سے لوگوں کے عقاید رسم و رواج کے بارے میں اندازہ لگایا۔ ایک امیر کے گھر میں پاپائے رس کے بنڈل تھے، یہ شاید اس کی لائبریری تھی۔ شہر کی دریافت اہل یورپ کے لئے ایک تہلکہ مچانے والی خبر تھی۔ دانشوروں، آرٹسٹوں، مورخوں اور سیاحوں کا تانتا بندھ گیا وہ اس شہر کو دیکھنے آئے۔ کسی دانشور نے آثاروں کی دریافت کے بارے میں بڑا اچھا جملہ کہا کہ ''کپڑوں کی تہوں میں دبی ممی ہے کہ جس کی تہوں کو ماہرین کھول کر اس کی حقیقت تک جاتے ہیں۔''

اس دریافت نے آثارِ قدیمہ کے علم اور نئی دریافتوں کے لئے ایک ستون کو پیدا کیا چنانچہ اس سے متاثر ہو کر ایک جرمن سرمایہ دار شلی من (Schleimann) نے بیڑا اٹھایا کہ وہ ہومر کے

بیان کردہ شہر ٹرائے (Troy) کو دریافت کرے گا کہ جہاں مشہور ٹروجن جنگ لڑی گئی تھی۔ یہ جگہ ترکی میں تھی، چنانچہ شلی من نے اس جگہ کی کھدائی کی اور دعویٰ کیا کہ اس نے ٹروئے کے بادشاہ پرائم (Prime) کا خزانہ دریافت کرلیا ہے۔ جسے وہ خاموشی سے لے کر یونان چلا گیا۔

اس کے بعد یونان اور روم کے قدیم آثاروں کی دریافت شروع ہوئی اور ان کے کانسی ولوہے کے عہد کے شہر اور بستیاں معلوم ہوئیں، جنہوں نے ان کی تاریخ کو نئے سرے سے تشکیل کرنے میں مدد دی۔

میسو پوٹامیہ کے آثاروں کی کھدائی نے خط میخی کے رسم الخط کو دریافت کیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد گل گامیش کی داستان سامنے آئی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے قدیم داستان ہے۔ 1798ء میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو وہ اپنے ساتھ ماہرین کی ایک جماعت لے کر آیا تھا، جنہوں نے مصر شناسی کی ابتداء کی۔ روزیٹا کی دریافت نے مصر کے قدیم رسم الخط کے پڑھنے میں مدد دی جس کی وجہ سے اس کی تاریخ کو مرتب کیا گیا۔

ہندوستان میں 1920ء کی دہائی میں وادیء سندھ کی تہذیب کے بارے میں علم ہوا، مگر اس کا رسم الخط نہ پڑھنے کی وجہ سے اس کے بارے میں بہت سی معلومات ادھوری رہیں۔ لیکن ہندوستان میں آثاروں کی کھدائی نے قدیم ماضی کی دریافت میں حصہ لیا۔ قدیم کتبوں اور سارناتھ کے آثار نے اشوک کے بارے میں معلومات دیں۔ الورا اور اجنتا کے غاروں نے تہذیب کے ایک نئے پہلو کی جانب اشارہ کیا۔ چین میں آثاروں کی کھدائی نے پہلی مرتبہ قدیم چین کی تہذیب وتمدن کے بارے میں قیمتی معلومات دیں جن سے اندازہ ہوا کہ ماضی میں اس نے شاندار تہذیب کو جنم دیا تھا۔ اس کے بعد سے قدیم آثاروں کی کھدائی اور دریافت کا سلسلہ جاری ہے۔ اب ہر ملک اس کے ذریعہ اپنے کھوئے ہوئے ماضی کو دریافت کر رہا ہے اور تاریخ میں بیش بہا اضافے ہو رہے ہیں۔

آثاروں کی کھدائی اور ماضی کی دریافت نے لوگوں میں اس جذبہ اور شوق کو پیدا کیا کہ وہ اس کو آج کے عہد میں تشکیل کر کے آزمائیں کہ اس وقت لوگ کس طرح سے رہتے تھے اور ان کی کیا سرگرمیاں تھیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے انگلستان میں لوہے کے زمانہ کا ایک گاؤں بنایا گیا، جس کی عمارتیں، مکانات، اور سڑکیں وگلیاں اسی طرح کی تھیں پھر ان گھروں میں رضا کاروں کو

رکھا گیا کہ جو اس عہد کے مطابق زندگی گزارنے کا تجربہ کریں گے۔ اس قسم کی ایک کوشش جرمنی میں ہوئی۔ لیکن ماضی کو دھرانے کا عمل فلموں میں بہت اچھے طریقہ سے ہوا، جب قدیم عہد کے کسی موضوع پر فلم بنائی گئی تو انہوں نے کوشش کی کہ اس عہد کی مکمل طور پر عکاسی ہو اور ماضی کو ان کے ذریعہ زندہ کیا جائے۔

ماضی کی ٹیکنالوجی کو زندہ کرنے کے تجربات بھی ہوئے۔ پرانے جہازوں کی شکل کے جہاز بنائے گئے تاکہ سمندری سفر کے بارے میں آگہی ہو۔ قدیم راستوں اور شاہراہوں کی دریافت ہوئی، کئی ٹیموں نے سکندر کے راستے کی دریافت کی اور اس پر چلتے ہوئے ہندوستان تک آئے۔

چندلوگوں نے ایک ہاتھی کو لے کر ہینی بال کے راستے پر کوہ اپس کو پار کرنے کا تجربہ کیا۔ اب وقتاً فوقتاً یورپ اور امریکہ میں مختلف جنگوں کو دوبارہ سے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ لوگ اس دور کے یونیفارم، ہتھیاروں، اور لڑنے کے طریقوں کو دیکھیں۔

میں نے آثارقدیمہ کے علم سے بہت کچھ سیکھا، کہ تاریخ ایک تسلسل کا نام ہے۔ یہ تسلسل ٹوٹتا رہا ہے، جسے آثارقدیمہ جوڑ رہے ہیں۔ مگر اس تسلسل میں برابر تبدیلی آرہی ہے۔ روایات، رسم ورواج، ان میں تسلسل بھی ہے اور تبدیلی بھی۔ دنیا ایک جگہ ٹھہری ہوئی اور جامد نہیں رہتی ہے۔ ہر عہد اپنی جگہ پُرشکوہ ہوتا ہے اگر اس میں آرٹ، ادب اور علم تخلیق کا سلسلہ رہا ہو۔ جب تخلیق رکتی ہے تو معاشرہ پس ماندہ ہو جاتا ہے۔

یہ علم اس کی نشان دہی بھی کرتا ہے کہ انسان ضرورت کے تحت اپنے ماحول کو بدلتا رہتا ہے۔ وہ تہذیبیں کہ جو دریاؤں کے ساحلوں پر پیدا ہوئیں، انہیں زراعت و کاشتکاری اور آب پاشی میں مشکلات پیش نہیں آئیں، مگر وہ تہذیبیں کہ جو دریاؤں سے دور تھیں وہاں زراعت کے لئے انسان کو سخت محنت کرنی پڑی، اور ضرورت نے نئی ٹیکنالوجی کو پیدا کیا۔ جس کی مثال یونان ہے کہ جس کی زمین سخت تھی، اس لئے انہیں ہل چلانے کے لئے جانوروں کے علاوہ ٹیکنالوجی کی ضرورت ہوئی۔

اس سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ جب علم کھو جاتا ہے تو دوبارہ سے اسے دریافت کرنے اور سیکھنے کے لئے انسان کو کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ان آثاروں نے یہ بھی ثابت کیا کہ ماضی کا انسان مجسمہ

تراشی، عمارت سازی اور مصوری میں کس قدر آگے تھا۔

آثار قدیمہ تہذیبوں کے عروج وزوال کی داستان بھی پیش کرتے ہیں اور مورخوں کے لئے یہ سوالات چھوڑتے ہیں کہ وہ ان کی دریافت کو ڈھونڈیں۔ اب آثار قدیمہ قوموں کی شناخت کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ خاص طور سے نئے آزاد ملکوں میں ان آثار کی مدد سے ملک اپنے پرانے ماضی کو واپس لا کر اپنی تاریخ کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ آثار سیکولر سوچ اور فکر کو پیدا کر رہے ہیں، کیونکہ مذہب ان قدیم تہذیبوں کی بنیاد نہیں تھا بلکہ ایک حصہ تھا۔ اس لئے جب قدیم تہذیب سے رشتہ جوڑا جاتا ہے تو وہ مذہبی تعصبات سے بالاتر ہوتا ہے اور اس کی بنیاد قوم پرستی ہو جاتی ہے۔

علمی سفر کی ابتداء تو ہے، مگر اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے نہ ختم ہونے والا۔ کہتے ہیں کہ البیرونی کے آخری لمحات میں اس کا ایک عالم دوست اس سے ملنے آیا۔ البیرونی نے اس کے سامنے ایک مسئلہ رکھا اور کہا کہ وہ اب تک اس کو سمجھ نہیں سکا ہے، اس لئے اس کا ذہن پریشان ہے۔ اس عالم دوست نے اس کی وضاحت کی، جب وہ گھر سے نکلا اور ابھی گلی ہی میں تھا کہ اسے البیرونی کے گھر سے رونے کی آوازیں آئیں۔ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس کی وفات ہو گئی ہے۔ اس پر اس عالم نے کہا، خدا مغفرت کرے، یہ آخری وقت تک علم کی جستجو میں رہا۔

اب جب میں زندگی کے اس مقام تک پہنچنے کے بعد اپنے علمی سفر کے بارے میں سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ سفر کس قدر کٹھن اور کس قدر مشکل، پُر پیچ راہوں سے گزارتا ہوا یہاں تک لایا۔ حقیقت کی جستجو، بار بار ایک حقیقت سامنے آئی، اس سے انکار کیا، دوسری کی جانب جانا پڑا۔ پتہ نہیں کہ میں سچائی کو تلاش کر پایا یا نہیں۔ ٹراٹسکی نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ انقلاب کے بعد جب وہ اپنے باپ سے ملنے گیا اور انقلاب کے بارے میں بتایا تو اس کے باپ نے کہا، چلو اب تمہاری سچائی کو بھی دیکھ لیں گے۔ انسان کسی نہ کسی سچائی کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ لوگ جو کسی ایک سچائی کو پا کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور تلاش بند کر دیتے ہیں، وہ سکون کی حالت میں ہوتے ہیں۔ ورنہ جستجو کا جذبہ ذہن کو پریشان کرتا رہتا ہے۔

وہ لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جو زندگی بھر علم کے حصول میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر وہ اس علم سے کسی کو فیضیاب نہیں کرتے اور یہ سارا علم اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر علم کو حاصل کیا جائے تو اس میں دوسروں کو شریک کرنا بھی ضروری ہے ورنہ علم کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔

اپنے اس علمی سفر میں اگر میں شعروشاعری کا تذکرہ نہیں کروں تو زیادتی ہوگی، اور نوجوانوں کی طرح میں بھی شعروشاعری سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اردو کے کلاسیکل شعراء چونکہ کورس کا ایک حصہ ہوا کرتے تھے اس لئے میں نے میر، سودا، ناسخ، انیس، انشاء، پنڈت دیا پرشاد وغیرہ کے منتخب کلام کو پڑھا، پھر ذوق، مومن اور غالب آئے۔ نوجوانی کے اس دور میں اقبال سے بڑا متاثر تھا، ان کا شکوہ وجواب شکوہ تقریباً زبانی یاد تھا۔ ان کے گھن گرج کے اشعار دل کو گرماتے تھے۔ اس وقت مشاعروں کا بڑا رواج تھا، تعلیمی اداروں کے علاوہ لوگوں کے گھروں پر مشاعرے ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ ہر سال آل انڈیا پاکستان مشاعرہ ہوتا تھا۔

جب میں انٹر کا طالب علم تھا، یعنی 1959ء میں تو سٹی کالج، جہاں میں پڑھتا تھا وہاں ایک یادگار مشاعرہ کا اہتمام ہوا۔ شاید یہ وہی کتاب ہے جو فرحت اللہ بیگ نے لکھی ہے، یا کوئی اور تحریر۔ اس میں میر سے لے کر غالب تک تمام شعراء تھے۔ میں نے اس مشاعرہ میں مصحفی کا کردار ادا کیا۔ غالب کا کردار فلمی دنیا کے مشہور اداکار محمد علی نے کیا تھا۔ اس مشاعرہ کی تیاری ریڈیو پاکستان کے ایک پروڈیوسر تھے جنہیں لوگ بھائی جان کہتے تھے۔ انہوں نے خوب ریہرسل کرائی تھی کہ کس طرح شاعروں کے ہر شعر میں، سبحان اللہ، واہ واہ، یا مکرر کہنا چاہئے۔ اس میں میک اپ کے لئے لاہور سے کسی کو بلایا گیا تھا۔ اس نے ہم سب کو بدل کر رکھ دیا، منہ پر داڑھی، پگڑی، اور لباس چغہ یا لبادہ۔ مجھے یاد ہے کہ جب والد اس کمرے میں آئے جہاں ہم میک اپ کرا کے کھڑے تھے تو وہ مجھے نہیں پہچان سکے۔ چونکہ ابھی میں نے پگڑی نہیں باندھی تھی، اس لئے وہ میرے بالوں سے پہچان سکے۔

ہوا یہ کہ جب ہم اسٹیج پر پہنچے اور مشاعرہ شروع ہوا تو ہم لوگ سارے ڈائیلاگ بھول گئے، مگر ہر شعر پر سبحان اللہ، واہ واہ اور مکرر کہہ کر لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں جرأت کے قریب تھا، چونکہ وہ نابینا تھے اس لئے میں نے ان سے ہر شاعر کا تعارف کرانا شروع کر

دیا۔ حضرت شمع میر صاحب کے آگے ہے، یا اب شمع سودا کے سامنے ہے، بھائی جان کا کہنا تھا کہ پہلے تو وہ پریشان ہوئے کہ ساری محنت اکارت جا رہی ہے، مگر جب مشاعرہ اپنے جوبن پر پہنچا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس مشاعرہ کی شہرت ہوئی تو اس وقت کے گورنر مغربی پاکستان اختر حسین نے فرمائش کی کہ اسے ان کے لئے دوبارہ کیا جائے، لہٰذا یہ دوبارہ ہوا اور کامیاب رہا۔ مجھے مصحفی کی وہ غزل تو یاد نہیں رہی کہ جو میں نے اس مشاعرے میں پڑھی تھی، مگر اس کا مقطع اب تک یاد ہے۔

مصحفی، گوشہء عزلت کو سمجھ تخت شہی
کیا کرے گا تو عبث تخت سلیماں لے کر

لیکن پھر وقت کے ساتھ شاعری سے دلچسپی کم ہوتی چلی گئی، اور مرزا غالب اور میر کے علاوہ کسی کے اشعار بھی یاد نہیں۔ اب مشاعروں کا رواج بھی نہیں رہا، لیکن اچھے شعراء گر سننے کو مل جائیں۔ شاعروں کی تعداد ہمارے ہاں اب بھی بہت ہے مگر شعر فہمی کی کمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔

علم کے اس سفر میں، میں نے جو کچھ حاصل کیا، اس میں دوستوں کو شریک کرنے کی غرض سے ایک تو میں پڑھاتا رہا، اب بھی لیکچر دینے کا سلسلہ جاری ہے۔ دوسرے میں نے کتابیں لکھیں تا کہ ان کے ذریعہ اپنے ہم سفروں میں اضافہ کروں۔ اس لئے میرے اس سفر میں، میں اکیلا نہیں ہوں، میرے ساتھ بہت سے ہم سفر ہیں، مجھے خوشی ہے کہ میں نے جو آگہی اور فہم حاصل کیا، اس میں دوسرے بھی برابر کے شریک ہیں۔

میری تاریخ نویسی

طالب علمی کے زمانے میں ہمیں جو تاریخ پڑھائی گئی، وہ سیاسی تاریخ تھی کہ جس میں شاہی خاندان کا ذکر تھا، جنگوں کی تفصیلات تھیں، سلطنت کے انتظامی امور کے بارے میں بتایا جاتا تھا، اور تھوڑا بہت دربار کے کلچر پر روشنی ڈالی جاتی تھی، وہ شعراء اور علماء جو دربار کی زینت ہوتے تھے، یا فنِ تعمیر کے سلسلہ میں شاہی محلات، مقبرے، باغات اور یادگاروں کی تعمیر۔ اس تاریخ میں کہیں عام لوگ نہیں ہوتے تھے۔ نہ ان کے طرزِ زندگی کے بارے میں کوئی ذکر ہوتا تھا، اور نہ ہی ان کی سرگرمیوں کو تحقیق کر کے سامنے لایا جاتا تھا۔

جدوجہد آزادی کی تاریخ پڑھائی جاتی تھی، تو اس میں کولونیل حکومت کی اصلاحات، کانگرس اور مسلم لیگ کی باہمی کش مکش اور برطانوی حکومت سے مطالبات کے سلسلہ میں گفتگو۔

ان دو قسموں کی تاریخ پڑھنے کے بعد جو تاثر ابھرتا تھا، اول تو یہ کہ بادشاہ اور ان کا خاندان ہی حکومت کے حق دار ہیں۔ اگر وہ لوگوں کو سہولتیں دیتے ہیں تو یہ ان کی مہربانی، رحمدلی اور رعایا پروری تھی، ورنہ اگر وہ نہ دیتے تو ان سے مطالبہ کرنے کا کسی کو حق نہیں تھا۔ جنگیں ہوا کرتی تھیں، توسیع سلطنت کے لئے، شکست کھانے والے کے مال و دولت پر قبضہ کرنے کے لئے۔ ان جنگوں میں عام فوجی جو مارے جاتے تھے، ان کے مرنے کے بعد ان کے خاندان کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا تھا یہ لوگ تاریخ میں گمنام ہو جاتے تھے۔

اس تاریخ میں کسانوں سے ریونیو وصول کرنے کے احکامات ہوتے تھے، مگر یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس وصولی کے بعد کسانوں کو کس طرح غربت اور مفلسی کی حالت میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔

اس تاریخ کو پڑھنے کے بعد کبھی عہد سلاطین کے فوجی کارناموں پر فخر کیا جاتا تھا، تو کبھی

مغلیہ دور کی شان و شوکت اور دولت کی فراوانی حیرت زدہ کر دیتی تھی۔

اس تاریخ میں فاتحین کے تذکرے بڑی شان سے ابھر کر آتے تھے۔ محمد بن قاسم کہ جس نے کم عمری میں سندھ کو فتح کیا۔ اس کی رواداری کے قصے اور یہ کہ سندھ کے لوگوں نے اسے بطور مسیحا قبول کیا کہ جس نے ملک کو ظالم و جابر راجہ سے چھٹکارا دلایا، اور لوگ ان سے اتنی محبت کرتے تھے کہ جب وہ واپس گیا تو اس کے مجسمے بنائے، اور یاد رکھا۔

محمود غزنوی کے سترہ حملے اور ان تمام حملوں میں اس کی فتوحات، سومناتھ کے مندر میں بت کو توڑنے پر بت شکن کا خطاب، جو اس کی مذہبی عقیدت اور اس کا توحید پر ایمان کو ظاہر کرتا تھا۔

محمد غوری نے اگرچہ گجرات اور پھر تراوڑی کے میدان میں شکست کھائی، مگر اس نے ان شکستوں کا بدلہ لیا اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم کی۔ ایک ایسی حکومت کہ جس نے ہزار برس تک ہندوؤں کو غلام بنائے رکھا۔

جدوجہد آزادی کی تاریخ میں شخصیتوں کا ذکر ہے کہ جنہوں نے مسلمان قوم کی شناخت کو محفوظ رکھا، اور آزادی نہ صرف انگریزوں سے لی، بلکہ ہندوؤں کے تسلط سے بھی خود کو آزاد کرایا۔ پاکستان کا قیام ان ہی راہنماؤں کی وجہ سے ممکن ہوا۔

اس تاریخ کو پڑھ کر ایک تو یہ تاثر قائم ہوا کہ آزادی کے حصول اور پاکستان کے قیام میں صرف راہنماؤں کا حصہ ہے۔ اس جدوجہد میں عام لوگ شریک نہیں تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح، اس تاریخ میں اہم کردار نظر آتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے سیاسی تدبر کے ساتھ ایک نیا ملک حاصل کیا۔

یہ تاریخ پہلے بھی اسی طرح سے پڑھائی جاتی تھی، جیسے آجکل، اس نصاب میں کوئی زیادہ فرق نہیں آیا ہے۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے جو تاثر ابھرتا ہے اور جو ذہن بنتا ہے، کیا وہ ہمیں صحیح تاریخی شعور دیتا ہے؟

اس ماحول میں، میں نے تاریخ کے موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ میرا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس روایتی تاریخ سے ہٹ کر، قارئین کو بتایا جائے کہ تاریخ کا مضمون بدل چکا ہے اور اس کا دائرہ سیاست و معیشت سے بڑھ کر سماجی و ثقافتی، جذبات کی تاریخ، اور اشیاء کی تاریخ تک آ گیا ہے۔

میں نے سب سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ فلسفہ تاریخ کے موضوع پر لکھا جائے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ تاریخ کے عمل میں کون سی قوتیں، ادارے، روایات، خیالات وافکار اور نظریات ہوتے ہیں کہ جو اس کو آگے بڑھاتے ہیں۔ کیونکہ واقعات کا محض بیان کر دینا انفارمیشن کی حد تک تو صحیح ہے مگر جب تک اس کے پس پردہ جو قوتیں ہیں، ان کو نہیں سمجھا جائے گا اس وقت تک تاریخ کا مضمون کوئی شعور اور آگہی پیدا نہیں کرے گا۔

اس سلسلہ میں، میں نے سب سے پہلی کتاب ''تاریخ کیا ہے؟'' لکھی، یہ ایک مختصر سا جائزہ تھا، تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے بارے میں اس مضمون کو پڑھ کر میں جس نتیجہ پر پہنچا وہ یہ کہ کیا ہم تاریخ سے سیکھتے ہیں؟ میرا اپنا خیال اس کے خاتمہ تک یہ ہوا کہ ہم تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے، ہم اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں، لیکن یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد ماضی کی غلطیوں کو نہیں دھرانا چاہئے، ایسا تاریخ میں نہیں ہے، ہم ان ہی غلطیوں کو بار بار دھراتے ہیں کہ جو ماضی میں کی جا چکی ہیں۔ ہم نے جنگ کی تباہ کاریوں سے کچھ نہیں سیکھا اور آج بھی اسی طرح سے برسرِ پیکار ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جب میں نے تاریخ اور فلسفہء تاریخ کا مزید مطالعہ کیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں اس نتیجہ تک پہنچنے میں غلطی پر تھا۔ تاریخ کو اس طرح سے نہیں پڑھنا چاہئے کہ جیسے یہ نصیحت کی کتاب ہو، اور ہم اس کی نصیحتوں پر عمل کریں۔ تاریخ اتنی سادہ نہیں ہے، یہ ایک پیچیدہ اور مشکل عمل ہے، جو انسانی ذہن، اس کی سرگرمی، اس کے احساسات وجذبات کو ظاہر کرتا ہے۔ تاریخ کی وسعت اور اس کی گہرائی کا احساس اس وقت ہوا جب میں نے ہیگل کے نظریہ تاریخ کا مطالعہ کیا۔

ہیگل کے بارے میں بعض اسکالرز کی یہ رائے ہے کہ جس طرح سے فرانسیسی انقلاب نے بحث ومباحث، افکار وخیالات اور نظریات کے دروازے کھولے تھے، اسی طرح سے ہیگل کے نظریہء تاریخ نے ایک انقلاب کو جنم دیا کہ جس سے پورا یورپ اور اس کے دانشور متاثر ہوئے، اس لئے فرانسیسی انقلاب کی طرح وہ بھی ایک اہم تاریخی واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس نے یورپ کے نظریات اور اس کی فکری تاریخ میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔

یورپ میں تاریخ کے مضمون میں اس وقت اہم تبدیلی آئی جب رینان ساں دور کے

دانشوروں نے عہد وسطیٰ کو تاریک قرار دے کر رومی اور یونانی تہذیبوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور ان کے ماضی کی تشکیل سے نئے خیالات وافکار پیدا کئے۔ اس مرحلہ پر ماضی کی اہمیت ابھر کر سامنے آئی۔ اس کے بعد فرانسیسی انقلاب نے اس بحث کو ابھارا کہ کیا ماضی ضروری ہے؟ کیونکہ انقلاب نے ماضی کی روایات سے انحراف کرتے ہوئے انہیں ختم کردیا اور نئی انقلابی روایات اور اداروں کی تشکیل کی۔ ایڈمنڈ برک (Edmond Barke) نے اس مرحلہ پر فرانسیسی انقلاب کی مخالفت کرتے ہوئے دلیل دی کہ ماضی کی روایات اور اداروں کے ختم ہونے سے سوسائٹی بحران کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان کی اس لئے ضرورت ہے کہ ان کی بنیاد پر تاریخی عمل آگے بڑھتا ہے۔ ان کے خاتمہ کے نتیجہ میں انتشار اور بدامنی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے وہ انقلاب کے بجائے ارتقائی عمل کو ابھاریں۔

اس لئے جب میں نے اردو میں لکھنا شروع کیا، تو میں تاریخ کے بنیادی فلسفیانہ نظریات اور تاریخ نویسی کے مختلف مکاتب فکر سے واقف تھا، جیسے فرانس کے انالز (Annals) یا ہندوستان کے سبالٹرن (Subaltern) یا مارکسی نقطۂ نظر سے لکھنے والے، اس کا مجھے فائدہ ہوا، اور میں نے کوشش کی کہ اردو میں تاریخ نویسی کے نئے اسلوب اور طرز کو روشناس کرایا جائے۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے کوشش کی کہ آسان اور سہل زبان استعمال کی جائے تاکہ تاریخ کا علم جو آگہی اور شعور دیتا ہے اس کو مقبول بنایا جائے، تاکہ اس کے ذریعہ ذہنی تبدیلی کا آغاز ہو۔

اپنی کتاب مغل دربار میں، میں نے دربار کی رسومات، آداب اور اس سے پیدا ہونے والے کلچر کا بیان کیا ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ میں اس کی وضاحت کروں کہ درباری کلچر سے درباریوں کا اور پھر معاشرے کے دوسرے لوگوں کا کیا ذہن بنتا ہے۔ دربار میں جب ایک شخص بادشاہ کی قدم بوسی کرتا ہے، سجدہ تعظیمی بجالاتا ہے اور اس کے سامنے اپنی شخصیت کو کچل کر انکساری، عجز کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرتا ہے، تو اس کے نتیجہ میں اس کی خودداری اور اَنا کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا ہے کہ مزاحمت کر سکے، یا اپنی شخصیت کو ابھار سکے۔

الیس نوربرٹ (Elias Norbort) نے اپنی کتاب ''کورٹ کلچر'' (Court Culture) میں لکھا ہے کہ دربار میں نشست و برخاست، گفتگو اور خاموشی کے ساتھ حاضری کے نتیجہ میں

درباری اپنے جسم کی حرکات پر قابو پاتا ہے۔ زبان کے استعمال پر نظر رکھتا ہے۔ یہ کلچر درباریوں سے نکل کر معاشرے میں پھیلتا ہے۔

اردو میں اگرچہ تاریخ نویسی کی روایت خاصی پرانی ہے۔ ایک لحاظ سے اس نے فارسی کی تقلید کی، جس میں قدیم اور معاصر مورخوں کی تاریخ سے نکل کر، اسے اپنی زبان میں لکھ دیا جاتا تھا۔ مثلاً مرزا غالب کو خاندان تیمور کی تاریخ لکھنے کو کہا، تو انہوں نے بنیادی ماخذوں سے مواد حاصل کر کے، اپنے اسلوب اور طرز کے ساتھ تاریخ کو لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس طرز کی تاریخ نویسی میں واقعات سے زیادہ زبان و بیان کی اہمیت ہوتی تھی۔ لہٰذا اردو میں بھی اسی طرز کو اختیار کیا گیا۔ اس میں واقعات کی تصدیق کے بارے میں کوئی طریقہ کار نہیں تھا، اور نہ ہی تنقید اور تجزیہ کی ضرورت کو اہمیت دی جاتی تھی۔

موجودہ دور میں جب کہ یورپ کی تاریخ نویسی سے لوگ متعارف ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے انگریزی کو اپنا میڈیم بنایا، اور اس زبان میں لکھ کر اپنی پروفیشنل حیثیت کو تسلیم کرایا۔ اردو میں یہ طرز رواج نہیں پا سکا، شبلی اور دارالمصنفین کے مورخوں کے ہاں مواد کو جمع کرنے کا طریقہ کار تو ہے مگر اس مواد کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ شبلی کی تاریخ نویسی کا ایک مقصد تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کی عظمت کو ابھارا جائے۔ ان کے ہاں تاریخ اور مذہب مل جاتے ہیں، اس لئے ان کے تجزیہ میں جان نہیں ہے۔

حافظ محمود شیرانی بنیادی طور پر ماہر لسانیات تھے، مگر انہوں نے بہت سے تاریخی موضوعات پر بڑی تحقیق کے ساتھ بحث کی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اردو میں تاریخ نویسی کی روایات زیادہ چل نہیں سکیں۔ موجودہ دور میں تاریخ کا مضمون بدل چکا ہے۔ اب تاریخ کو کسی نہ کسی تھیوری یا نظریہ کی بنیاد پر لکھا جاتا ہے جیسے قوم پرستی، فرقہ واریت، مارکس ازم، اسٹرکچرل ازم، فیمنزم، پوسٹ ماڈرن ازم وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے جب تک ان تھیوریز کا علم وہ تاریخی واقعات کی تفسیر یا تاویل نہیں کر سکے گا۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مغل درباری کلچر کس طرح سے ہمارے معاشرہ میں مقبول ہوا، اور آج بھی اس کے اثرات موجود ہیں۔ مغل سوسائٹی کا ذکر کرتے ہوئے، میں نے طبقہ امراء کے کردار کا جائزہ لیا ہے کہ یہ طبقہ کس طرح سے قانون کی بالادستی سے آزاد تھا۔ دولت اکٹھی کرنے

میں رشوت، غبن سے لے کر عوام سے جبراً پیسہ وصول کرنا ان کا دستور تھا۔ اس طبقہ کی یہ خصوصیات آج بھی ہمارے بالادست طبقوں میں جاری ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی کی روایات آسانی سے دم نہیں توڑتی ہیں۔

عام لوگوں کی حالت کیا تھی؟ اگر ایک طرف شہنشاہ اور امراء کی دولت اور پُر آسائش زندگی تھی تو دوسری طرف غربت وافلاس، بے بسی اور مجبوری تھی۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا، یا اس میں تبدیلی آئے گی۔ اگر تبدیلی آئے گی تو اس کو لانے والا کون ہو گا؟

آخری عہد مغلیہ میں مغل شاہی خاندان اور اس کے اداروں کا زوال ہے، اگرچہ یہ زوال ایک خاندان کا تھا مگر اس سے خاص طور سے شمالی ہندوستان متاثر ہوا جب معاشرہ ٹوٹا تو اس نے لوگوں کے رویئے اور ذہن تبدیل کر دیئے۔ خاص طور سے امراء، شعراء اور علماء کا طبقہ سرپرستوں کی تلاش میں ہندوستان بھر میں ادھر سے ادھر جاتا رہا۔ آخر میں اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ ان حالات میں آخر کیوں ایسٹ انڈیا کمپنی اقتدار میں آئی؟ اگر اس کتاب کو پڑھ کر آج کے عہد خاص طور سے پاکستان کے حالات کو دیکھا جائے، تو ان میں مماثلت ملے گی، اور مقصد یہی ہے کہ ماضی کے تناظر میں حال کو سمجھا جائے۔ اسی سے متعلق دوسرے مضامین شاہی محل میں ہیں کہ ماحول کس قسم کی شخصیات کو پیدا کرتا ہے اور وہ کس حد تک اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس کے بعد میری توجہ سندھ کی تاریخ پر ہوئی اور میں نے خاص طور سے اس کے بنیادی ماخذوں کا تجزیہ کیا۔ چچ نامہ یا فتح نامہ کے بارے میں، میری رائے ہے کہ یہ عربوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس میں شکست خوردہ داہر اور اس کے ساتھی غائب ہیں۔ یہ چچ نامہ ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ جب بھی فاتح اپنی تاریخ تحریر کراتے تھے تو اس میں شکست خوردہ غائب ہو جاتے تھے یا ان کا تذکرہ منفی طور پر آتا ہے کہ وہ ظالم، عیاش اور اپنی رعایا میں غیر مقبول تھے اس لئے ان کی شکست پر عوام نے سکون کا سانس لیا اور فاتحین کو خوش آمدید کہا۔ عربوں کے حملے کے بارے میں تاریخی شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کے حملے اسلام کے ابتدائی زمانے سے شروع ہو گئے تھے جو امیہ حکومت میں جا کر کامیاب ہوئے۔ اس لئے یہ حملے اور سندھ پر قبضہ، یہ

امپیریل ازم کا ایک حصہ تھا، جب وسط ایشیا اور اسپین میں بھی اسی وقت میں قبضے کئے گئے۔ لہٰذا میں نے تاریخ کو مذہب سے نکال کر اس کو سیاسی تناظر میں دیکھا۔

سندھ کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ پڑھنے والا خود واقعات کی تفسیر کر سکے۔ اس لئے میں نے خاص طور سے تاریخ نویسی پر توجہ دی کہ سندھ کی تاریخ کیسے لکھی گئی؟ اور اب اسے کیسے لکھنا چاہئے؟

اگرچہ سندھ کی تاریخ پر میری تحریریں مختصر ہیں، مگر انہوں نے سندھ کے نوجوانوں کو متاثر کیا ہے اور ان کی روشنی میں نہ صرف انہوں نے اپنے ماضی کو نئے انداز سے سمجھا ہے، بلکہ حال کو بھی تنقیدی نظریہ سے دیکھا ہے۔ میرے ایک مضمون کیا ناؤمل غدار تھا؟ سندھ کے قوم پرستوں کی جانب سے اس پر تنقید ہوئی، جو ایک لحاظ سے بڑا اچھا شگون تھا کہ اس سے بحث و مباحثہ کا آغاز ہوگا، اور ہوا بھی یہی۔ سندھ کے نوجوانوں میں خاص طور سے ان تحریروں کی وجہ سے نہ صرف اپنی شناخت کا احساس ہوا، بلکہ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کی تحریکیں بھی اٹھیں۔

تاریخ کو جب حال کی سیاست، یا سماجی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس صورت میں تاریخ کے ان واقعات اور شخصیتوں کو ماضی سے باہر نکال کر لایا جاتا ہے اور ان کے کردار کی نئے انداز سے تشریح کی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض واقعات اور وہ افراد جو اپنے عہد میں گمنام رہے تھے اور ان کا ذکر تاریخ کے حاشیہ پر تھا، مگر زمانہ حال کی ضرورت ان کو ماضی سے زیادہ اہمیت دے کر ان کے ذریعے اپنے خیالات و نظریات کی تشریح کرتی ہے۔

ہندوستان میں انگریزی عہد میں مسلمان معاشرہ ایک نئی کش مکش سے دوچار ہوا۔ اس کش مکش کا شکار اکثر طبقہ اشرافیہ کے لوگ تھے، کیونکہ مغل حکومت کے خاتمہ نے سب سے زیادہ انہیں پریشان کیا تھا۔ کسان اور نچلے طبقے کے مسلمان اس صورت حال سے زیادہ متاثر نہیں تھے۔ لہٰذا ان حالات میں تاریخ کے استعمال کی ضرورت تھی کہ جو اشرافیہ کو نئی شناخت دے، اور ان کے سماجی رتبہ کو محفوظ کرنے کی کوشش کرے۔ اس راہنمائی میں علماء سرفہرست تھے لہٰذا ان علماء کے کردار اور شخصیت کو ابھارا گیا کہ جو موجودہ دور میں اشرافیہ کے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔

ان میں شیخ احمد سرہندی کی شخصیت کو اس نقطہ نظر کے ساتھ تاریخ کے پردوں سے باہر لایا

گیا کہ انہوں نے اکبر کے مذہبی خیالات کے خلاف جدوجہد کی اور برصغیر میں اسلام کا دفاع کیا۔ اکبر اس وجہ سے تنقید کا نشانہ بنا کیونکہ اس نے مذہب کے معاملہ میں غیر جانبداری کی پالیسی کو اختیار کرتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کی مدد سے اپنی سلطنت کو استحکام دیا تھا۔ حالانکہ شیخ احمد سرہندی اکبر کے عہد میں چار سال فعال رہے، مگر ان کی کوئی زیادہ مقبولیت نہ تو مسلمان عوام میں تھی اور نہ ہی علماء کے طبقے میں۔ جہاں گیر نے ضرور اپنی توزک میں ان کا ذکر کیا ہے، وہ بھی اس طرح کہ ان کے خطوط اور مکاتیب سے مسلمانوں اور مذہبی حلقوں میں ان کے خلاف سخت غم و غصہ تھا۔ اس لئے اس نے انہیں قلعہ گوالیار میں بھیج دیا کہ وہاں ان کا ذہنی توازن ٹھیک ہو۔

تاریخ کے ان حقائق سے منہ موڑ کر علماء اور چند مورخوں نے انہیں اکبر کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا۔ ہمارے نصاب کی کتابوں میں وہ ہندوستان میں دین کی حمایت کے سب سے بڑے داعی بن گئے۔ ان کی مذہبی تنگ نظری کا یہ عالم تھا کہ ہندو تو ہندو، شیعہ بھی ان کی نظر میں نہ صرف کافر بلکہ واجب القتل تھے۔ یہ وہ خیالات ہیں کہ جن کی عکاسی ہم آج چند مذہبی تحریکوں میں دیکھتے ہیں، جو مذہبی انتہا پسندی کے نمائندے ہیں۔ ان کے خیالات میں ہمیں شیخ احمد سرہندی کے افکار کی گونج سنائی دیتی ہے۔ وہ ہندو مسلم اشتراک کے سخت مخالف تھے، اور شریعت کے علم کے حصول میں جدید علوم کے مطالعہ کو بھی حرام قرار دیتے تھے، یعنی علم ریاضی، اور کہا جا سکتا ہے کہ سائنس اور سماجی علوم ان کی، ان کے نقطہء نظر سے مسلمانوں کے لئے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان علوم کے مطالعہ سے آج بھی پرہیز کر رکھا ہے۔

ان کے خیالات چونکہ دوقومی نظریہ کو تقویت دیتے ہیں، اس لئے پاکستان کے نصاب میں ان کی اہمیت اور زیادہ ہو گئی ہے۔

دوسری اہم شخصیت، شاہ ولی اللہ کی ہے کہ جسے موجودہ دور کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تاریخ سے باہر نکالا گیا اور آج کے زمانہ کے مطابق ان کے خیالات کی تشریح کی گئی۔ ان کی شخصیت کو ابھارنے میں اور لوگوں کے ساتھ مولانا عبیداللہ سندھی کا بڑا حصہ ہے، جب وہ ہندوستان سے افغانستان اور وہاں سے روس گئے کہ جہاں انہوں نے کمیونسٹ انقلاب کی تبدیلیوں کو دیکھا تو انہیں یہ خیال آیا کہ مسلمان مفکرین اور علماء میں ایسی شخصیت کو تلاش کیا جائے

کہ جسے مارکس کی طرح تبدیلی کا مرکز بنا کر، مسلمان معاشرے میں انقلاب لایا جائے۔ان کی کتاب ''شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک'' اس کا مظہر ہے۔جس میں انہوں نے انہیں ایک انقلابی مفکر کے طور پر پیش کیا ہے۔لیکن جب شاہ ولی اللہ کی دوسری تحریروں اور ان کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ہندوستان کو وطن نہیں سمجھتے تھے، اور نہ ہی ہندوستان کی دوسری طاقتوں اور مذاہب کے ماننے والوں سے اشتراک چاہتے تھے۔ وہ مسلمانوں کا اقتدار قائم کرنے کے خواہش مند تھے۔اس لئے انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی کہ مرہٹوں کی طاقت کو ختم کیا جائے۔ اس وقت بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی سیاسی طاقت حاصل کر رہی تھی، مگر وہ اس خطرے کو محسوس نہیں کر سکے۔ مرہٹوں کی کمزوری نے انگریزوں کے لئے میدان صاف کر دیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کے افکار ہندوستان کے مسلمانوں میں نہ تو مذہبی اتحاد قائم کر سکے اور نہ ان میں اپنے عہد کے حالات کو سمجھنے کا شعور آیا۔ برصغیر میں رہتے ہوئے علیحدگی کے تصور نے مسلمان معاشرے کو تنہا کر دیا، اور وہ جدید عہد کے تقاضوں کو سمجھنے میں ناکام رہے۔

تیسری اہم شخصیت، سیّد احمد شہید اور ان کی تحریک محمدی یا جہاد تحریک ہے جسے جعفر تھانیسوری کے علاوہ غلام رسول مہر نے اس پر تحقیق کی۔ سیّد احمد شہید نے جہاد کا اعلان انگریزوں کے خلاف نہیں کیا جو کہ غیر ملکی تھے اور ہندوستان پر قابض تھے، بلکہ سکھوں کے خلاف کیا کہ جو ہندوستانی تھے اور جنہوں نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔انہوں نے سرحد میں جو اسلامی ریاست قائم کی، اس کی اکثر جنگیں سکھوں سے زیادہ پٹھانوں سے ہوئیں، یہاں شریعت کے نفاذ میں جو سزائیں دی جاتی تھیں، اس نے لوگوں کا ساتھ دینے کے بجائے ان کا مخالف بنا دیا۔اس تحریک نے ہمارے زمانہ کے طالبان کی تحریک کو ایک ماڈل دیا کہ جس میں مسلمانوں کی پستی اور زوال کی وجہ یہ ہے کہ وہ جہاد نہیں کرتے۔ جہاد کا یہ جذبہ اور جوش دوبارہ سے پیدا کرنے میں اس تحریک کا بڑا حصہ ہے۔

میں نے اس کا تنقیدی جائزہ لیا، اور اس تحریک کو پٹھانوں کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی کہ جن کی مرضی و خواہش کے بغیر جہادی تحریک کو ان کے علاقے میں شروع کیا گیا۔ شمالی ہندوستان اور پٹھانوں کے درمیان جو سماجی اور ثقافتی فرق تھا، اسے نہیں دیکھا گیا۔اسی وجہ سے یہ

تحریک ناکام ہوئی۔مگر اس کی ناکامی سے کوئی سبق نہیں سیکھا گیا، اور آج طالبان اسی نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

پاکستان میں ابھرتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی کے خلاف ہمارے حکمراں طبقے کو اس کا حل یہ بتایا گیا کہ صوفیاء کی تعلیمات کو عام کیا جائے۔ مذہبی تشدد کو روکنے کے لئے مغربی مستشرقین نے بھی صوفیاء کی تاریخ کا سہارا لیا، اور اچانک صوفیاء کی تاریخ، ان کی تعلیمات، اور ان کی شاعری پر کتابیں شائع ہونے لگیں۔ یورپ اور امریکہ میں اچانک مولانا رومی کی دریافت ہوئی تو ہمارے دانشوروں کو بھی ان کی عظمت کا خیال آیا، اور ان پر بھی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا، بالکل ایسے جیسے کسی زمانہ میں عمر خیام یورپ میں مقبول ہوا، تو ہمیں بھی اس کی شاعری میں نئے معنی اور مفہوم نظر آنے لگے۔

کسی نے اس بات کی زحمت نہیں کی کہ مذہبی انتہا پسندی کی ابتداء اور اس کی مقبولیت کا جائزہ لیتا اور یہ تجزیہ کرتا کہ آخر یہ کیوں پیدا ہوئی ہے، جب اس کی وجوہات کا پتہ چل جاتا تو اس صورت میں اس کے خلاف کوئی لائحہ عمل بنایا جاتا۔

لیکن یہ خیال کرنا کہ بلھے شاہ کی شاعری اس کو ختم کر دے گی، خیال خام ہے۔ دوسرے صوفیاء کے سلسلوں اور ان کے اور اس ماحول وحالات کا جائزہ لینا تھا کہ جس میں یہ مقبول ہوئے۔ تاریخ میں تحریکوں کی پیدائش اور ان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس عہد کی سیاسی ومعاشی اور سماجی قوتوں پر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں صوفیاء کے سلسلہ اس لئے مقبول ہوئے کہ یہ وحدت الوجود کے قائل تھے، ہندوستان میں حکمرانوں کو اس کی ضرورت تھی کہ کشمکش اور تضادات کے بجائے رعایا میں ہم آہنگی اور اشتراک ہو۔ اس لئے انہوں نے بھی ان سلسلوں کی حمایت کی، صوفیاء کو خانقاہیں بنا کے دیں اور ان کے گزارے کے لئے عطیات دیئے۔ انہوں نے کبھی حکمرانوں کے خلاف مزاحمت اور بغاوت کی تعلیم نہیں دی۔

میری دلیل یہ ہے کہ جب صوفیاء اپنے مریدوں کو صبر، قناعت اور شاکر ہونے کی تلقین کریں گے تو اس صورت میں حکومت کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائے گا۔

مزید برآں صوفیاء کے بارے میں یہ غلط فہمی بھی ہے کہ یہ پُر امن تھے، سارے صوفیاء ایسے نہیں تھے۔ جہادی صوفیا بھی تھے کہ جنہوں نے غیر مسلموں کے خلاف جنگوں

میں جہاد کیا تھا۔

اسی طرح صوفی شریعت کے خلاف نہیں تھے، بعض ملامتی اور قلندری فرقوں کو چھوڑ کر یہ شریعت کے پابند تھے۔ ایک اور غلط فہمی بھی صوفیاء کے بارے میں یہ ہے کہ ان کی وجہ سے اسلام پھیلا۔ حالانکہ صوفیاء مذاہب کی تبلیغ میں قطعی دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور نہ ان کے سلسلے مشنری تھے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ بعض علاقوں میں لوگ ان کے مذہبی تقدس کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔ مگر ہندوستان میں اسلام پھیلنے کی اور دوسری وجوہات ہیں۔

لیکن صوفیاء کو بھی اپنی برتری کا احساس تھا، اس کی شکل روحانی تھی۔ ان کی مجلس بادشاہ کے دربار کی مانند ہوتی تھیں، جہاں درباری ادب آداب بجالاتے تھے۔ صوفیاء نے جو ورثہ چھوڑا ہے وہ درگاہوں اور سجادہ نشینوں کی شکل میں موجود ہے۔ درگاہوں پر زائرین آتے ہیں، عرس کے موقع پر ہزارہا لوگوں کا مجمع ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ مذہبی انتہا پسندی کو روکنے میں کامیاب ہوئے؟

صوفی سلسلہ تاریخ کے خاص ماحول اور عہد کی پیداوار تھے، اب ان کا احیاء ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اگر مذہبی انتہا پسندی کو ختم کرنا ہے تو اس کی وجوہات کو تلاش کر کے اس کا علاج ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ صوفیاء کی تعلیمات کا احیاء کرنے والے ذہنی طور پر مفلوج ہیں اور اس قابل نہیں ہیں کہ آج کے حالات کے مطابق خیالات و افکار اور منصوبہ بندی کے ذریعہ اس کا خاتمہ کیا جائے، یہ ماضی کی روایات کو ماضی کے خیالات سے ختم کرنا چاہتے ہیں کہ جو ممکن نہیں ہے۔

جاگیرداری کے موضوع پر میں نے لکھا تا کہ اس ادارے کے جو سیاسی و سماجی اثرات ہمارے معاشرے پر پڑ رہے ہیں ان کو سمجھا جا سکے۔ پاکستان میں کچھ دانشور یہ دلیل دینے لگے ہیں کہ اب پاکستان میں جاگیرداری نہیں رہی، شاید ان کے ذہن میں انگلستان کی مثال ہو کہ جہاں اٹھارہویں صدی میں صنعتی انقلاب سے پہلے زراعتی انقلاب آیا۔ جس میں مشینوں کے استعمال نے کسانوں کو بیروزگار کیا اور جب صنعتی عمل شروع ہوا تو یہ بیروزگار کسان، فیکٹریوں میں مزدور بن گئے۔ جاگیرداروں نے صنعتی عمل میں حصہ لیا اور اس میں سرمایہ کاری کی، جس کی وجہ سے وہاں سرمایہ داری کا غلبہ ہوا۔ پاکستان اس صورت حال سے دوچار نہیں ہے۔ ہمارے ہاں جاگیرداروں کی اکثریت کی آمدنی زراعت پر ہے اور زمین ان کے سماجی مرتبہ کا تعین کرتی ہے۔

اس کے علاوہ جاگیردارانہ کلچر پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ جس میں معاشرہ طبقاتی طور پر تقسیم ہوا ہے۔

اگرچہ سیاست میں وہ لوگ آ گئے ہیں کہ جو جاگیردار اور وڈیرے نہیں ہیں۔ مگر بڑی سیاسی جماعتوں میں یہی جاگیردار غالب ہیں اور یہی اب بھی جیتنے والے امیدوار ہیں۔ اس وجہ سے سیاست پر اس وقت بھی ان کا تسلط ہے۔

جاگیرداری کے ادارے کو استحکام کولونیل دور میں ہوا کہ جب جاگیر کو نجی جائیداد کی حیثیت ملی۔ انگریزی حکومت نے ان لوگوں کو مستقل جائیداد دے کر ان کے سماجی مرتبہ کو استحکام دیا اور پھر ان کی مدد سے انہوں نے عام رعایا کو کنٹرول کیا۔ یہ پورے انگریزی دور میں ان کے وفادار رہے اور ان کے لئے خدمات سرانجام دیں۔ موجودہ دور کے جاگیردار انہیں کی اولاد ہیں۔ اس لئے ان کے رجحانات مراعات میں فرق نہیں آیا ہے۔ یہ آج بھی برسرِ اقتدار جماعت کے ساتھ ہوتے ہیں اور اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

میں نے نصابی کتابوں میں لکھا ہے۔ نصابی کتابوں کا معاملہ یہ ہے کہ ریاستیں ان کتابوں کے بارے میں بڑی حساس ہوتی ہیں۔ یہ قومی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد سے ہوا۔ ورنہ جب تعلیم ریاست یا حکومت کے تسلط میں نہیں تھی تو مذہبی اداروں نے اس کا ذمہ لیا تھا۔ یورپ میں تعلیمی ادارے چرچ کے ماتحت ہوتے تھے۔ شارلیمن جس نے یورپ میں اپنا سیاسی تسلط پھیلایا اور ایک بڑی امپائر کی بنیاد رکھی، وہ خود تو اَن پڑھ تھا، مگر اس نے تعلیم کی طرف توجہ دی۔ امپائر کے اتحاد کے لئے سب سے بڑی ضرورت تو یہ تھی کہ اس کی ایک زبان ہو، لہٰذا اس نے لاطینی زبان کو سرکاری طور زبان کا درجہ دیا۔ اس کے بعد تعلیم کے فروغ کے لئے چرچ کے ادارے کو استعمال کیا۔ کیتھڈرل اسکول، جو اس وقت یورپ اور برصغیر میں انگریزی کے عہد کے پھیلے ہوئے ہیں، ان کی بنیاد شارلیمن نے ہی ڈالی تھی۔ اس نے چرچ کے عہدیدار بشپ کو کہا کہ وہ بشپ اسکول قائم کریں بعد میں جب ریفارمیشن نے عیسائی دنیا کو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں تقسیم کر دیا، تو کیتھولک فرقے میں جیسوئٹ (Jesuits) کی جماعت پیدا ہوئی، جنہوں نے خاص طور سے تعلیم کی طرف توجہ دی اور یورپ کے سب سے عمدہ ماہر تعلیم ہو گئے۔ ان کے تعلیمی اداروں میں یورپ کی اشرافیہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ تعلیم سے چرچ کا تسلط اس وقت ختم ہوا کہ جب فرانس میں

1789 میں انقلاب آیا۔ اس میں ریاست نے تعلیم کو چرچ سے لے کر اس کی ذمہ داری خود سنبھالی۔ اگرچہ قومی ریاست کا وجود 1642 میں ویسٹ فیلیا کے معاہدے کے بعد آ گیا تھا، مگر فرانسیسی انقلاب نے اس ادارہ کو مضبوط بنایا۔ جب تعلیم قومی ریاست کے پاس آ گئی تو اس نے اس کے ذریعہ نوجوانوں میں قومی شعور، اور قومی فخر کے احساسات کو پیدا کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔

ہندوستان اور پاکستان میں یہ ذمہ داری آزادی کے بعد دونوں ریاستوں کو ملی لہٰذا ان کی نصاب کی کتابوں میں آزادی کے بعد تاریخ کو نئے سرے سے لکھا گیا۔ خاص طور سے آزادی کی جدوجہد کی تاریخ۔ ہندوستان میں جب بی۔ جے۔ پی کی ہندو انتہا پسند جماعت برسرِ اقتدار آئی تو انہوں نے نصاب کی کتابوں کو تبدیل کر کے ان میں اپنے نظریات کو ڈال دیا لیکن جب ان کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو کانگرس کی حکومت نے نصاب کی کتابوں کو نئے سرے لکھوا دیا اور کوشش کی کہ ان میں کسی کے خلاف نفرت اور دشمنی کا مواد نہ ہو۔

پاکستان کو چونکہ ایک نظریاتی ملک قرار دیدیا گیا ہے لہٰذا یہاں پر نصاب کی کتابوں میں نظریات کا فروغ ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے طالب علموں میں جو تنگ نظری اور نفرت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں، اس کا اثر پورے معاشرے کے ماحول پر پڑ رہا ہے۔

میں نے ایک تو ان نصابی کتابوں پر تنقید کی، اور ان کے موضوعات کا جائزہ لیا۔ دوسری جانب میں نے طالب علموں کے لئے تاریخ کی نصابی کتابیں لکھیں۔ یہ ''تہذیب کی کہانی'' کے عنوان سے تین حصوں میں ہے، یعنی پتھر کا زمانہ، کانسی کا زمانہ اور لوہے کا زمانہ۔ دوسری جلد میں قدیم ہندوستان، عہد وسطیٰ کا ہندوستان اور برطانوی ہندوستان ہے، ان کا انگریزی ترجمہ ڈان اخبار کے بچوں کے میگزین ''ینگ ورلڈ'' میں بھی چھپ چکا ہے۔ ان کتابوں کی تحریر میں ڈاکٹر روبینہ سہگل کا حصہ ہے کہ جو اس وقت ایکشن ایڈ کی ڈائریکٹر تھیں۔ انہوں نے زبردستی یہ کتابیں لکھوائیں۔ حالانکہ بچوں کی کتابیں لکھنے کا میرا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مگر جب یہ کتابیں شائع ہوئیں تو لوگوں نے کافی پسند کیں۔ ہمارے دوست مرحوم مرتضیٰ جنہوں نے کہا کہ میں ان کا انگریزی ترجمہ کروں جو وہ ینگ ورلڈ میں شائع کریں گے۔ اس طرح دوستوں کے اصرار پر یہ کام ہوا۔

افسوس یہ ہے کہ یہ کتابیں سرکاری اسکولوں کے نصاب کا حصہ نہیں بن سکیں۔ اگر انہیں

اسکولوں میں پڑھایا جاتا تو اس کے کچھ نتائج نکلتے۔ لیکن نہ جانے کیوں محکمہ تعلیم کے لوگ میرے نام سے پریشان ہو جاتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کتابوں میں نہ جانے کون سا مواد ہوگا کہ جو نظریہ پاکستان کے لئے مناسب نہیں ہوگا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو شاید نوجوانوں سے زیادہ بڑے لوگوں نے پڑھا ہے۔

میرے نزدیک نصابی کتابوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کو لکھوانے کے لئے ماہرین تعلیم کی ضرورت ہے۔ تاکہ نوجوان ان کو پڑھ کر مزید قوموں اور فرقوں سے نفرت نہ کریں، بلکہ ان میں علم کی جستجو اور تحقیق کا جذبہ پیدا ہو۔

میں نے ہیرو ورشپ کے خلاف کافی لکھا ہے۔ جن معاشروں میں ماضی سے لے کر حال تک ہیروز کو بنایا جاتا ہے، اور ان شخصیات کو حکمراں طبقہ یا جماعتیں اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتی ہیں، اسی کی وجہ سے لوگوں میں تخلیق کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نوجوانوں کے لئے کوئی ''رول ماڈل'' ہو۔ یہ تصور ہی میرے نزدیک غلط ہے، کیونکہ نوجوانوں سے یہ کہنا کہ وہ تقلید کریں اور خود کو اس نمونہ میں ڈھالنے کی کوشش کریں، ان کے تخلیق کے جذبات کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ میں جب بھی نوجوانوں کو پڑھاتا ہوں تو کلاس میں پہلی بات یہ کرتا ہوں کہ ''بزرگوں کے نقش قدم پر مت چلنا'' بلکہ اپنا راستہ خود تلاش کرنا۔ بنے بنائے راستہ پر چلنا آسان اور سہل ہوتا ہے، مگر اپنے راستہ کو تعمیر کرنے میں محنت ہوتی ہے۔

ہیرو ورشپ ایک طرح سے لوگوں کے اپنے اندر لیڈرشپ کی جو صلاحیتیں ہوتی ہیں، انہیں ختم کر دیتی ہے۔ یہ آمریت کو آگے بڑھانے میں مدد دیتی ہے اور جمہوری روح کے خلاف ہوتی ہے۔ حکمراں طبقے شخصیتوں کو اس لئے استعمال کرتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ، اور ان کے خیالات کے سہارے وہ اپنے سیاسی تسلط کو برقرار رکھ سکیں۔ اگر اس نظام پر تنقید ہو تو شخصیت کو اس کے تحفظ کے لئے بطور ڈھال استعمال کریں۔ ان وجوہات کی بنا پر میرا نقطہء نظر یہ ہے کہ ہمیں ہیرو ورشپ کے تصور سے خود کو آزاد کر کے، ہر فرد کو یہ موقع دینا چاہئے کہ وہ صلاحیت اور قابلیت کا اظہار کر سکے، اسی صورت میں معاشرہ آگے بڑھے گا اور نئے خیالات و افکار پیدا ہوں گے۔

لہٰذا میں نے تاریخ اور تاریخ نویسی کے مختلف رجحانات پر لکھا تا کہ قاری تاریخ کو محض بیانیہ انداز میں نہیں پڑھے، بلکہ اس کے مفہوم کو بھی سمجھے۔ اس مطالعہ نے میری سوچ کو بھی بدلا، اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ تاریخ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ ہمیں کچھ سکھاتی نہیں ہے، غلط ہے۔ یہ ہمیں انسانی ذہن، فکر، اور انسانی تہذیب وتمدن کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

اس لئے اگر ہم تاریخ کے ان نظریات کو ہندوستان کی تاریخ پر اطلاق کریں تو ہم اس کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ ہیگل نے جب 1820 میں فلسفہء تاریخ پر لیکچرز دیئے تھے تو اس کے نزدیک صرف یورپ کی تاریخ میں وہ گہرائی ہے کہ جو یونیورسل روح کو دریافت کر سکتی ہے۔ باقی اقوام کی فکر میں اتنی گہرائی نہیں ہے، اس لئے اس نے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں یہ رائے دی تھی کہ یہ محض واقعات کا ایک چکر ہے یہ اپنے اندر کوئی مفہوم نہیں رکھتی ہے۔ افریقہ کو تو اس نے یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ وہ تاریک ہے۔

مگر اب نہ صرف ہندوستان، چین اور افریقہ کی تاریخ کی نئے سرے سے تشکیل ہوئی ہے بلکہ آثار قدیمہ نے ایشیا وافریقہ کی تہذیبوں کے بارے میں نئے نئے انکشافات کئے ہیں۔ اس وجہ سے ہیگل کے ان خیالات کو اب تنقیدی نقطہء نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں خاص طور سے کوسمبی نے قدیم ہندوستان کی تاریخ کو مارکسی نقطہء نظر سے دیکھا ہے۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے تاریخ کا مضمون انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

اس سوچ نے قدامت پرست اور ترقی پرست کے نام سے دانشوروں کے دو گروہ پیدا کئے جو نظریات اور افکار کے مباحث میں آج بھی مصروف ہیں۔

ہیگل نے تاریخ کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس کا کام یونیورسل روح کی دریافت ہے، اور یہ نشان دہی کرتی ہے کہ یہ کن مراحل سے گزری ہے۔ یونیورسل روح کی دریافت میں آئیڈیئے یا فکر یا عقلیت اور آزادی کی دریافت ہے۔ اس سے انسانی فکر اور انسانی تہذیب کے ارتقائی مراحل کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہیگل کے نزدیک تاریخ کے ہر واقعہ کی اہمیت ہے، چاہے وہ بے معنی، اور بیکار ہی کیوں نہ نظر آتا ہو، وہ یونیورسل روح کی دریافت میں مددگار ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تاریخ اپنے اندر معنی اور مفہوم رکھتی ہے جو یونیورسل روح کی تشکیل کے سفر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کا مشہور فارمولا ہیگل کے مطابق تاریخ لامتناہی تبدیلیوں اور لامتناہی

کش مکش اور تضادات کا عمل ہے۔ Thesis antithesis and synthesis ہے۔ جو تاریخی عمل کو مسلسل حرکت میں رکھے ہوئے ہے۔ ہیگل کے فلسفہ نے دائیں اور بائیں بازو کے ہیگلین (Hegelian) پیدا کئے۔ بائیں بازو کے ان دانشوروں میں کارل مارکس مشہور ہے، جس نے ہیگل کے جدلیاتی نظریہ سے تاریخ میں طبقاتی جدوجہد اور کش مکش کو دریافت اور تاریخ کے عمل کو سمجھنے کا انقلابی انداز دیا۔

پاکستان کے معاشرے کی کم مائیگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاس ہیروز کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ اقبال اور محمد علی جناح کے ناموں کو اس قدر استعمال کیا گیا ہے کہ ان کی اصل شخصیت گم ہوگئی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ڈاکٹر صفدر محمود سے میرا ایک مکالمہ قائداعظم کے سلسلہ میں ہوا۔ وہ بڑی محنت سے انہیں مذہبی اور مقدس شخصیت بنانے میں مصروف ہیں۔ جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جناح صاحب لبرل اور مذہب کے بارے میں غیر جانبداری کا رویہ رکھتے تھے۔ اب پاکستان کی تاریخ میں ان کا چہرہ بدل گیا ہے۔ اقبال کی شاعری کو بھی نظریہ کے تحت اختیار کرلیا گیا ہے۔ تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ حکمراں طبقے، یا جماعتیں وگروہ شخصیتوں کو اپنے نظریات میں ڈھال کران کی آڑ میں اپنے مفادات پورے کرتے ہیں۔ کیونکہ خود ان کے پاس وہ خیالات و نظریات نہیں ہوتے اور نہ ان میں اتنی لیاقت وصلاحیت ہوتی ہے کہ اپنے دفاع میں عقلیت و دلیل کو استعمال کرسکیں۔

سرسیّد کی شخصیت اوران کی تعلیمات پر بھی میں نے لکھا ہے۔ وہ شمالی ہندوستان کی مسلمان اشرافیہ کے نمائندے تھے۔ وہ ایک ذہین اور دوررس نظر رکھنے والے دانشور تھے۔ انہیں پورا اندازہ تھا کہ مسلمان اشرافیہ میں اتنی توانائی، طاقت اور دیانت نہیں ہے کہ وہ انگریزوں سے مزاحمت کر سکیں۔ اس طرح انہوں نے مفاہمت کی پالیسی کو اختیار کیا، تاکہ اس کے سہارے وہ زندہ رہ سکیں۔ سیاست سے گریز کرتے ہوئے انہوں نے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا اور فرسودہ روایات کی جگہ جدیدیت کی تبلیغ کی۔

پاکستان میں ان کے ان خیالات کی اہمیت نہیں کہ جس میں انہوں نے مذہب کی جدید انداز میں تفسیر کر کے اس میں رواداری کے جذبہ کو پیدا کیا، نہ ہی جدیدیت کے خیالات کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ ہندو مسلم اشتراک کے حامی تھے، مگر پاکستان میں وہ دوقومی نظریہ کے بانی

بنا دیئے گئے ہیں۔

اب پاکستان میں سیاسی جماعتیں اپنے سربراہوں کو بطور ہیرو پیش کرتی ہیں، مگر یہ اس وقت تک ہیرو ہوتے ہیں، جب تک یہ سیاسی جماعتیں برسرِاقتدار ہوتی ہیں اور ان کے نام پر شاہراہیں، یونیورسٹیاں، ائیرپورٹ اور یادگاریں ہو جاتی ہیں، جیسے ہی یہ اقتدار سے علیحدہ ہوتی ہیں، ان کے ناموں کی تختیاں نکال دی جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئے نام آ جاتے ہیں۔ کچھ بااثر لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگی ہی میں اپنے نام کو کسی عمارت یا سڑک سے منسوب کرنا چاہتے ہیں۔ اس عمل کے پس منظر میں ان کے ذہن کی پس ماندگی نظر آتی ہے۔ چونکہ انہوں نے زندگی میں ایسے کارنامے سرانجام نہیں دیئے ہوتے کہ جس کی وجہ سے لوگ انہیں یاد رکھیں، اس لئے تاریخ میں اپنی جگہ بنانے کے لئے یہ عمارتوں او شاہراہوں کا سہارا لیتے ہیں کہ وہ ان کے نام سے مشہور ہو جائیں۔ لیکن عوام پرانے ناموں کو ہی یاد رکھتے ہیں، اور ان نئے ناموں کی صرف تختیاں لگی رہتی ہیں۔ تاریخ میں مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے لئے کام کیا جائے، اس صورت میں لوگ خود ان کو یاد رکھتے ہیں، اس کے لئے ضرورت نہیں ہوتی کہ اپنے نام کی تختی لکھوائیں یا نصب کرائیں۔

میں نے تاریخ اور عورت کتاب لکھ کر اس بات کی کوشش کی کہ یہ عورتوں کے بارے میں ہمارے ہاں جو روایتی خیالات ہیں، انہیں ختم کیا جائے۔ عورت کے سماجی رتبہ کے بارے میں روایت اور مذہب کا بڑا دخل ہے۔ روایت کو اس لئے اہمیت دی جاتی ہے کہ یہ ماضی کا تسلسل ہے اور اس میں کئی نسلوں کے تجربات شامل ہیں، اگر روایت کے تسلسل کو چھوڑ دیا گیا تو اس کے نتیجہ میں معاشرہ انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ روایت کو مذہب سے تقویت ملتی ہے۔ لہٰذا عورت کے بارے میں یہ کہنا کہ اسے آزادی ملے اور اس کی اپنی شخصیت ہو، اس کو روایتی معاشرے میں قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ وہ خاندان میں مرد کی برتری اور اس کی سربراہی کو بطور فطری حقیقت مانتے ہیں، اگر اس کی حاکمیت کو چیلنج کیا جائے تو خاندان بکھر جائے گا۔

میں نے تاریخ کے حوالہ سے اس کی تردید کی ہے۔ روایت کبھی ایک سی نہیں رہتی ہے یہ وقت اور ضرورت کے تحت تشکیل پاتی ہے اور بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے تاریخ میں عورت کا مقام

ہمیشہ سے ایک سا نہیں رہا ہے۔ لہٰذا آج کے بدلتے ہوئے حالات میں جب کہ ہر شعبہ اور پہلو میں تبدیلی آرہی ہے، عورت کو بھی ان روایتی زنجیروں سے آزاد ہونا ہے، اور یہ کام حالات کر رہے ہیں۔ تحریکِ نسواں جو یورپ سے چلی تھی، اور وہاں تبدیلی کا باعث ہوئی تھی، اب ہمارے معاشرے میں بھی اس کے اثرات آرہے ہیں۔

تحریکِ نسواں یا فیمن ازم (Feminism) کی اصطلاح سب سے پہلے فرانس میں استعمال ہوئی تھی۔ فرانسیسی انقلاب نے اگرچہ عورتوں کو ان کے حقوق تو نہیں دیئے، بلکہ ایک لحاظ سے عورتوں کی مخالفت کی۔ انہوں نے فرانسیسی انقلاب سے پہلے شاہی خاندان میں عورتوں کو جو عروج حاصل تھا، اس سے یہ اندازہ لگایا کہ عورتیں اگر اقتدار میں آجائیں تو یہ انتشار کا باعث ہوتی ہیں، جیسے میری انٹونیٹ (Mary Antonett) جس کو انقلابیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انہوں نے انقلابی خاتون اولم دی گھوش کہ جس نے مردوں کے حقوق کے اعلانیہ کے متضاد عورتوں کے حقوق کا اعلانیہ لکھا تھا، اسے بھی موت کی سزا دی۔ لیکن اس کے بعد سے یورپ میں عورتوں کی تحریکوں کی ابتداء ہوئی، جو رکی نہیں، بلکہ برابر آگے بڑھتی رہی۔

برصغیر ہندوستان میں عورتوں کے بارے میں نئے خیالات کولونیل دور میں پیدا ہوئے، اس قدامت پرست طبقوں میں اس پر سخت سراسیمگی اور پریشانی تھی۔ سرسیّد اگرچہ مردوں کی تعلیم کے حامی تھے، مگر عورتوں کو اسی طرح سے غیر تعلیم یافتہ رکھنا چاہتے تھے۔ اقبال بھی عورتوں کی آزادی کے خلاف تھے۔ مگر روایتی اور قدامت پرست حلقوں کی خواہش اپنی جگہ، مگر جیسے جیسے حالات بدل رہے ہیں عورتوں میں شعور آرہا ہے۔

میری کتاب میں عورتوں کی جدوجہد کی داستان ہے، جو انہیں اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ انہیں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے بہت سی روایتوں کو توڑنا ہوگا۔

کھانے کے آداب پر لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمارے ہاں لوگ کھانے پر جس بے ادبی اور ہلڑ کا مظاہرہ کرتے ہیں، انہیں اس کا احساس ہونا چاہئے کہ کھانا کھانا کس قدر مقدس اور اہم فریضہ ہے۔ کھانا کھانے سے کسی بھی معاشرے اور قوم کے کلچر کا پتہ چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تہذیب کے کس مرحلہ پر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب دعوتوں پر جاتے تھے تو کھانا فرش پر بیٹھ کر کھایا جاتا تھا، کھانا کھلانے والے آپ کی نشست پر ہی کھانا لے کر آتے تھے اور

ضرورت کے مطابق لوگوں کو دیا کرتے تھے، اس طرح جو جہاں بیٹھا ہے وہیں رہتا تھا۔ جب سے بوفے کا رواج ہوا، اس میں ایک تو کھڑے ہو کر کھایا جاتا ہے، اس لئے کھانا کھانے والا ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت میں رہتا ہے چونکہ کھانا لینا اس کا کام ہے، اس لئے وہ اپنی مرضی سے لیتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ دوسروں سے پہلے وہ اپنی پلیٹ کو کھانے سے بھرے۔ لہٰذا اس تبدیلی کی وجہ سے ڈسپلن نہیں رہا اور لوگوں میں بے چینی اور گھبراہٹ پیدا ہوگئی کہ وہ کھانے سے محروم نہ ہو جائیں۔

چونکہ کسی کی جگہ کا تعین نہیں ہے۔ اس لئے لوگ میز کی طرف بھاگتے ہیں تاکہ اپنے لئے مناسب جگہ حاصل کر لیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر کھانا بیٹھ کر کھایا جائے تو اس ہنگامہ سے بچا جا سکتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں انہوں نے قطار بنانے کا سسٹم کیا ہے، اس صورت میں بھی ہر شخص کو اس کی باری پر کھانا مل جاتا ہے اور افراتفری پیدا نہیں ہوتی ہے۔

میں نے اس سلسلہ میں مغرب اور مشرق دونوں معاشروں میں کھانے کے آداب میں جو ارتقاء ہوا ہے، اس میں بحث کی ہے، تاکہ یہ اندازہ ہو کہ آداب بھی، تہذیب و کلچر، اور شعور کے ساتھ بدلتے ہیں، ان میں سائنس کی دریافت کا بھی دخل ہے کہ جراثیم سے بچنے کے لئے ہاتھ دھو کر کھانا کھانا چاہئے۔

میں نے ٹھگوں اور ڈاکوؤں کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ یہ دونوں گروہ معاشرے میں اس وقت پیدا ہوتے ہیں کہ جب ریاست کے ادارے کمزور ہو جاتے ہیں، روزگار کے ذرائع بند ہو جاتے ہیں اور ریاست کا جبر بڑھ جاتا ہے۔ ٹھگوں کے گروہوں کا خاتمہ انگریزی دور میں ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر ان کا خاتمہ نہ کیا جاتا تو نہ راستے محفوظ رہتے، نہ تجارت کو فروغ ہوتا، اور نہ انگریزی حکومت کی عزت رہتی۔ اسی طرح انہوں نے ڈاکوؤں کے خلاف بھی مہم کا آغاز کر کے انہیں ختم کیا۔

اگرچہ اب ٹھگ تو نہیں رہے، مگر ٹھگی کی اصطلاح یہ ضرور چھوڑ گئے ہیں۔ ٹھگی میں فریب، چالاکی، چال بازی اور دھوکہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ لوگوں کو بیوقوف بنا کر انہیں لوٹتے ہیں۔ ٹھگی کا یہ سلسلہ آج بھی ہمارے معاشرے میں جاری ہے۔

اس کے مقابلہ میں ڈاکو طاقت، دھونس اور ڈرا کر لوٹتا ہے۔ ڈاکوؤں کے سلسلہ میں یہ بھی رواج ہے کہ وہ امیروں کو لوٹتے ہیں۔ ظاہر ہے غریبوں کے پاس کچھ ہوتا ہی نہیں کہ لوٹا جائے،

اس لئے وہ غریبوں میں ہیرو کا مقام حاصل کر لیتے ہیں، اگر وہ لوٹ کے مال میں غریبوں کو بھی شامل کر لیں تو ان کی عزت اور بڑھ جاتی ہے۔ سندھ میں وقتاً فوقتاً ڈاکوؤں کا ابھار ہوتا رہتا ہے، چونکہ لوگ ریاست کے جبر سے تنگ ہیں اس لئے ان ڈاکوؤں کو ریاست کے مقابل خیال کرتے ہوئے ان کی حمایت کی جاتی ہے۔ میں نے ٹھگ اور ڈاکوؤں کی تاریخ میں ان کے کردار اور ان کی اہمیت پر لکھا ہے۔ خاص طور سے موجودہ دور میں سندھ میں ڈاکوؤں کی بڑی تعداد کا ابھرنا سیاست کا مظہر ہے۔ اس لئے اس عمل کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

ان کے علاوہ میں نے جن اور موضوعات پر لکھا ہے، ان میں پاکستان کی شناخت، نیشنل ازم، کولونیل ازم، اور سیکولرازم کے نظریات اور ان کا تاریخی کردار، مارشل لاء کے سماجی اثرات، جمہوریت کا ارتقاء، دانشور اور معاشرہ وغیرہ وغیرہ ہیں۔ میری دوسری کتابوں میں چھوٹے چھوٹے مضامین شامل ہیں، جو آجکل کے حالات کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ تاریخ اور سیاست میں انقلاب کے بارے میں تجزیہ کیا گیا ہے۔

میری تحریروں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگ تاریخ کو محض سیاست اور حقیقت تک محدود نہ رکھیں، بلکہ اسے وسیع مفہوم میں سمجھیں کہ یہ زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی کرتی ہے لہٰذا اسی ضمن میں، میں نے نجی زندگی کی تاریخ میں، جو فرانسیسی مورخوں کی کتابوں پر مبنی مواد پر ہے، اس میں یہ تجزیہ کیا گیا ہے کہ معاشرہ کس طرح سے اجتماعی روایات اور زندگی سے گذر کر انفرادی علیحدگی تک آیا، اور کس طرح اب نجی زندگی کا تعلق فرد سے ہے، اس میں خاندان اور برادری کو دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے لطف اللہ کی آپ بیتی کا ترجمہ اس لئے کیا کہ اس میں انیسویں صدی کا ہندوستان اور اس کا معاشرہ ہے۔ یہ اس عہد کا ایک فرد دیکھ رہا ہے اور اس کے عہد میں ہونے والے واقعات کو بیان کر رہا ہے، کہ جس میں انگریزی اقتدار آہستہ آہستہ آ رہا ہے۔

کیتھارینا بلوم کی کھوئی ہوئی عزت، یہ ہنرش بال کا مختصر ناول ہے جس میں اس نے زرد صحافت اور اس کے سماج پر اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ یہ صحافت آج ہمارے ہاں بھی خرابیاں پیدا کر رہی ہے، اس لحاظ سے یہ ناول ہمارے حالات کے مطابق ہے۔

برتولڈ بریخت کی تحریریں تو ہماری سوسائٹی پر مکمل طور پر پوری اترتی ہیں۔ اس نے بہت کچھ

لکھا ہے، وہ ڈرامہ نگار، افسانہ نویس، شاعر اور مضمون نگار تھا۔اس کے اجتماعی کام کو تقریباً بیس پچیس جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ میں نے اس کے چند مضامین، افسانے، اور ایک ڈرامے کا جرمن زبان سے ترجمہ کیا ہے۔

حال ہی میں، میں نے پاکستانی معاشرے پر ایک مختصر کتاب لکھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اس کی پس ماندگی کا تجزیہ کیا جائے۔ کسی بھی معاشرے میں بولی جانے والی زبان اور اس کے جملے اس کے ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ پاکستان میں جس طرح سے مذہب کی رسومات کا رواج ہوا ہے۔اس وقت سے زبان میں ایسے جملے آ گئے ہیں کہ جو بولنے والا محض عادتاً انہیں بولتا رہتا ہے۔ لیکن ان جملوں سے معاشرے کی سوچ کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً اب عام گفتگو میں کہا جانے لگا ہے کہ ''دعاؤں میں یاد رکھنا'' اگر آپ کسی کی کامیابی پر مبارکباد دیں تو اس کا جواب ہوگا، خدا کا فضل یا خدا کا کرم ہے۔ اگر کسی نے رشوت اور بدعنوانی سے دولت اکٹھی کی ہے تو وہ بھی اسے خدا کا فضل ٹھہرا کے اسے پاک صاف کر لیتا ہے۔ اب ہر بات کو خدا سے منسوب کر کے فرد تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سے ہماری سیاسی زبان کی ایک خاص شکل ہو گئی ہے۔ مثلاً دشمن کے دانت کھٹے کر دیں گے، قوم سیسہ پلائی دیوار بن جائے، قومی مفاد کے لئے جان دیدیں گے، ہم محبِ وطن پاکستانی ہیں، ہمیں اپنے ملک سے محبت ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اب لوگ ان جملوں کو ان کے مفہوم کو سمجھے بغیر بولتے ہیں، اور یہ سلسلہ رسماً ہو گیا ہے اور یہ رسمی جملے اب ہماری زبان اور کلچر کا حصہ بن گئے ہیں۔

1999ء میں، ہم نے دوستوں کے ساتھ مل کر سہ ماہی تاریخ کی اشاعت شروع کی۔ اب تک اس کے 44 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ہم نے کوشش کی کہ اسے علمی رسالہ کے طور پر چھاپیں اور یہ تحقیقی مضامین، نئی کتابوں پر تبصرے، اور تاریخ کے بنیادی ماخذوں کا مجموعہ ہو۔ چونکہ ہمارے ہاں اردو میں تحقیقی مضامین لکھنے والے بہت کم ہیں، اس لئے ہم نے انگریزی کے مضامین کے تراجم کرائے۔ اس رسالہ کے سلسلہ میں جن لوگوں نے ساتھ دیا ہے، ان میں اشفاق سلیم مرزا، ڈاکٹر سیّد جعفر احمد، ڈاکٹر انور شاہین، غافر شہزاد اور ڈاکٹر ہما غفار قابل ذکر ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ رسالہ تاریخ کے اساتذہ اور طالب علموں میں مقبول ہوگا، مگر ایسا نہیں ہوا، اسے پڑھنے والے عام

قاری ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہمارا خیال تھا کہ اس کو ہم تحریک کی شکل دے سکیں گے۔ اس میں بھی ہم کامیاب نہیں ہوئے۔ اس رسالہ کے خاص نمبر تاریخ کی وہ کانفرنسیں ہوتی ہیں جو ہم کوشش کر کے ہر سال کرتے ہیں۔

یہ تاریخ کانفرنسیں، سہ ماہی تاریخ اور دوسرے اداروں کے تعاون سے کرتے ہیں۔ اب تک ہم 14 کانفرنسیں کر چکے ہیں۔ یہ لاہور، کراچی، حیدرآباد اور گجرات میں ہوئیں جو خاص موضوعات رہے وہ تاریخ نویسی، پنجاب کی تاریخ، سکھ اور پنجاب، لاہور، سندھ کی تاریخ، پہلی جنگ آزادی 1857، نیشنل ازم، کولونیل ازم، عورت اور تاریخ، تاریخ اور عوام، اور تاریخ اور جنگ شامل ہیں۔ ان کانفرنسوں میں جو مقالا جات پڑھے گئے وہ ہم نے تاریخ میں شائع کر دیئے۔

ہماری یہ کانفرنسیں بہت سادہ ہوتی ہیں۔ مقررین اپنے خرچے سے ان میں شریک ہوتے ہیں، لنچ میں دال چاول دیئے جاتے ہیں۔ مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ لوگوں نے ان میں دلچسپی لی، اور بڑی تعداد میں طالب علم شریک ہوئے۔ اگرچہ ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، مگر ہم رسالہ اور کانفرنسوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

کیا میری تحریروں کا کچھ اثر ہوا ہے؟ اس کا تھوڑا بہت اندازہ مجھے سندھ اور بلوچستان جا کر ہوا، وہاں نوجوانوں میں پڑھنے کا رواج ہے اور لوگ میری کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سرائیکی نوجوانوں میں بھی پڑھنے کا شوق ہے۔ مگر پنجاب میں شاید اس کی تعداد کم ہے۔ کیا اس کا تعلق ملک کی سیاست سے ہے کہ جو لوگ مرکز کے جبر کا شکار ہیں، ان میں جاننے کی خواہش زیادہ ہے۔ لیکن میں اپنی تحریروں میں قطعی یہ کوشش نہیں کرتا کہ کسی خاص طبقے کو خوش کروں۔ میرے نزدیک لکھنے کا مقصد مقبولیت حاصل کرنا نہیں، بلکہ لوگوں کے شعور اور فہم میں اضافہ کرنا ہے۔

عام لوگوں کے علاوہ جہاں تک دانشوروں اور سیاست کے سربراہوں کا تعلق ہے تو دائیں اور بائیں بازو کے دونوں طبقے مجھے پسند نہیں کرتے ہیں۔ اس کا اظہار کبھی لفظوں میں ہوتا ہے اور کبھی عام تقریروں میں۔ چاہے وہ سندھ کے قوم پرست ہوں یا پنجاب کے۔ اگر ان کی پسند کی بات نہیں ہوگی تو میں ایکدم ان کے نزدیک قابل جرم ٹھہرایا جاؤں گا۔ سندھ میں مکٹر اور

پنجاب میں بھیا ہو جاؤں گا۔ یہ میرا المیہ ہے کہ میں ہندوستان سے آیا ہوں، اپنی مرضی سے نہیں۔ اس لئے مولانا آزاد کی بات یاد آتی ہے کہ جب ہندوستان سے لوگ ہجرت کر کے آ رہے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ اس وقت تو جا رہے ہو، مگر جب سندھ اور پنجاب میں قوم پرستی کے جذبات ابھریں گے تو تم اس ملک میں بن بلائے مہمان ہو جاؤ گے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنی سوچ اور فکر کے باوجود لبرل، اور ترقی پسند حلقوں میں اجنبی ہی سمجھا جاتا ہوں، اور یہ لوگ میری ذات کو ایک تنگ گلی میں دھکیل کر لبرل شناخت کا تعین کرتے ہیں۔

ایک بار میرے اعزاز میں ایک فنکشن تھا جس میں دوستوں نے میرے کام کے بارے میں تعریفی مضامین پڑھے۔ اس میں بائیں بازو کی ایک سیاسی جماعت کے سربراہ بھی تھے۔ جب انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا، ڈاکٹر مبارک علی نے کون سا کمال کیا اگر پچاس کتابیں لکھ دیں۔ جب میرا نمبر آیا تو میں نے کہا کہ یقیناً ان کی بات درست ہے اور میں پشیمان ہوں کہ میں نے کیوں کتابیں پوچھے بغیر لکھ دیں۔ لیکن اس تنقید کے بعد بھی کتابیں لکھنے کا یہ سلسلہ جاری رہا اور اب ان کی تعداد بڑھ کر 70 تک ہوگئی ہے۔ پتہ نہیں ہمارے بائیں بازو کے ان لیڈر پر کیا گزری ہوگی۔ حبیب جالب کہا کرتے تھے کہ شاعروں نے انہیں موچی دروازہ پر اکیلا چھوڑ دیا ہے مگر اس سے ان کی حیثیت متاثر نہیں ہوئی۔ بلکہ جنہوں نے انہیں اکیلا چھوڑا تھا، وہ آج کہیں نظر نہیں آتے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ کیا میں نے کتابیں لکھ کر اپنی عمر کا بڑا حصہ ضائع کیا؟ ہمارے دوست اسلم گورداسپوری کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے، تحریر کا اثر ضرور ہوتا ہے، وہ حوصلہ دیتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ لکھتے رہنا چاہئے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ میں بالکل تنہا ہوں، دوست اور احباب ساتھ میں ہیں، چاہے ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو، ان کے سہارے زندگی گزر رہی ہے۔

میرے بارے میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں، ایک زمانہ میں مجھے روسی ایجنٹ کہتے تھے، اب اس کی جگہ میں ہندوستان کا ایجنٹ ہوگیا ہوں۔ میرے نظریات کو جانے بغیر کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ میں پاکستان اور مذہب کا مخالف ہوں۔ جرمن کی ایک کہاوت ہے کہ اگر لوگ آپ کے مخالف ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے خیالات و افکار میں

جان ہے جس سے یہ لوگ خوفزدہ ہوتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں نے کہیں اپنے بارے میں کوئی لیبل نہیں لگایا ہے، مگر لوگ خود سے میری ذات اور خیالات کا تعین کر کے مجھے کسی نہ کسی لقب سے نواز دیتے ہیں۔

لیکن یہ سب میرے راستے میں حائل نہیں۔ میں اب بھی برابر لکھ رہا ہوں۔ روزنامہ ڈان کے میگزین میں میرا ایک کالم چھپتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب ان کالموں کی تعداد بڑھ جاتی ہے تو میں انہیں کتابی شکل دیدیتا ہوں۔ دوسرے ہمارے دوست ایوب ملک ہر مہینہ بدلتی دنیا میں لکھواتے ہیں، ان کی ہمت ہے کہ وہ پابندی سے یہ رسالہ چھاپ رہے ہیں۔

میرا سرمایہ میری تحریریں ہیں۔ ان تحریروں کے پس منظر میں میری جدوجہد، اور میرا علم ہے۔ علم کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں تکمیل حاصل کر لی ہے کیونکہ بقول کارل پوپر My Knowledge Increases my Ignorance یعنی جتنا علم حاصل کیا جاتا ہے اسی قدر اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا احساس ہوتا ہے۔

تاریخ کے تاثرات

جب قومیں زوال پذیر ہو جاتی ہیں، تو اس کے ساتھ ہی ان کی بہادری، جرأت، حوصلہ اور عظیم اخلاقی اقدار بھی رخصت ہو جاتی ہیں، اور ان اقوام کے لوگ ماضی کی شان وشوکت میں پناہ لے کر ماضی کی یاد میں گم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ گیا ہوا ماضی کبھی واپس نہیں آتا ہے۔ مسولینی نے بڑی کوشش کی کہ قدیم رومی عہد کو واپس لے آئے، مگر ایسا ہوا نہیں، نہ ہی اہل یونان اپنے ماضی کا احیاء کر سکے اور نہ عرب اپنی قدیم عظمت کو بحال کر سکے۔

تاریخ میں طاقت کا کردار اہم رہا ہے، جب قومیں طاقت ور ہوتی ہیں، تو ان میں رعونت اور برتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، دوسری اقوام ان کی نظروں میں انسانیت سے گری اور تہذیب سے عاری ہو جاتی ہیں اس لئے ان کو شکست دینا، قتل کرنا، ان کے مال واسباب پر قبضہ کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

یہی صورتِ حال افراد کی ہوتی ہے، جب ایک فرد با اختیار ہوتا ہے طاقت ور ہوتا ہے، تو دوسرے لوگ اس کے لئے کم تر مخلوق ہو جاتے ہیں، مگر جب یہ شخص طاقت واقتدار سے محروم ہو جاتا ہے تو اچانک اس کی شخصیت بدل جاتی ہے۔

مثلاً مغل بادشاہ فرخ سیر جب تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے مخالفوں کو قتل کر دیا۔ ان کی لاشوں کو ہاتھی کے ساتھ باندھ کر شہر میں تشہیر کرائی، مگر جب اسے تخت سے محروم کر کے قیدی بنا لیا گیا تو یہی فرخ سیر معمولی ضروریات کے لئے اپنے نگہبانوں کی خوشامد کرتا نظر آتا ہے۔ طاقت کی محرومی نے اس کی شخصیت کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔

مثلاً جب رومی جنرل فتح کے بعد واپس آتے تو شکست خوردہ قوم کا مال واسباب اور ان کے حکمراں بطور قیدی لائے جاتے تھے، ان کی خاص طور سے نمائش ہوتی تھی۔ شکست خوردہ قوم

کے حکمرانوں اور شہزادوں کو سونے کی زنجیروں میں قید کر کے پیدل چلایا جاتا تھا اور سڑک کے دونوں اطراف کھڑے لوگ خوشی و مسرت کا اظہار کرتے تھے کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس عظمت کے پس منظر میں کس قدر خوں ریزی اور لوگوں کی بربادی ہے۔

جب قوموں کا یہ عروج ہوتا ہے تو اس کا عام فرد بھی کہ جسے اس کا کوئی حصہ نہیں ملتا ہے وہ قومی فخر و مباہات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ ان فتوحات میں اس کا بھی حصہ ہے۔

اس فخر کا مظاہرہ ہم برطانوی دورِ اقتدار میں بھی دیکھ چکے ہیں کہ جب اس کی ایشیا و افریقہ کے ملکوں پر حکومت تھی، اس وقت ایک عام انگریز کہ جو خود غربت و مفلسی کا شکار تھا، مگر قوم کے اس عروج پر اس کا سر بلند ہو جاتا تھا اور دوسری اقوام کے لوگ اس کے نزدیک کم تر ہو جاتے تھے۔ یہی صورت حال اس وقت امریکیوں کی ہے کہ جو اپنی قوم کی قتل و غارت گری کو عظمت سمجھتے ہوئے، اس پر نازاں ہے۔

اور یہ تو ہمارے سامنے کی بات ہے۔ صدام حسین جو عراق کا انتہائی طاقتور آمر تھا، جس نے اپنے مخالفوں کو گولی سے اڑا دیا، یہاں تک کہ اپنے دامادوں کو بھی نہیں بخشا، جب اس کی حکومت کا تختہ الٹتا ہے اور وہ قیدی بن جاتا ہے تو اس کی شخصیت یکدم بدل جاتی ہے۔ اب وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہے، وہ ایک عام فرد ہے، یہ تبدیلی اس کے لئے کس قدر ذہنی اذیت کا باعث ہوگی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں عام لوگ اپنے ماضی کو شاندار سمجھتے ہیں، اور اس پر فخر کرتے ہیں؟ اول تو ماضی کو شاندار بنانے والے مورخ ہوتے ہیں، جو سیاست یا مذہب کے تحت کسی خاص عہد کو شاندار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کو شاندار بنانے میں فتوحات کا ذکر زیادہ ہوتا ہے، علم و ادب کو اس عظمت میں کم ہی شامل کیا جاتا ہے، تاریخ کے اس انداز کی وجہ سے اس کا استعمال سیاست میں ہوتا ہے اور سیاستداں ماضی کی شاندار واپسی کا نعرہ لگا کر لوگوں کے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ جیسے گاندھی جی رام راج کا نعرہ لگاتے تھے کہ وہ ہندوستان کو ایک ایسے دور میں لائیں گے جو رام کے عہد کی طرح پُر امن اور خوش حال ہوگا۔ اس قسم کے نعرے ہمارے سیاستداں اور مذہبی راہنما لگاتے ہیں، اور بقول شبلی نعمانی کے، کہ ہماری ترقی پیچھے کی

جانب جانے میں ہے۔

تاریخ میں حملہ آوروں کو ہیرو بنانے سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ حملہ آور چاہے اس کا تعلق کسی مذہب، نسل، اور قوم سے ہو، وہ تاریخ میں مجرم کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے بغیر کسی وجہ کے، مال و دولت کے لالچ یا اپنی عظمت بڑھانے کی خاطر دوسرے ملکوں پر حملہ کیا اور لوگوں کا قتل عام کیا۔ جس طرح ہم سکندر کو حملہ آور قرار دے کر اس کی مذمت کرتے ہیں، اسی طرح سے اپنے ہم مذہب حملہ آوروں کی بھی مذمت کرنی چاہئے، چاہے وہ محمد بن قاسم ہو یا محمود غزنوی اور محمد غوری۔

تاریخ میں ہم دو قسم کے افراد کو دیکھتے ہیں! وہ لوگ کہ جو حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں، اور پُر امن اور خوش حال زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری جانب وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو اپنی شرائط پر زندگی گزارنا چاہتے ہیں، حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتے ہیں اور غربت و اخلاص تنگ دستی اور تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ ان کے سامنے زندگی اور موت کا انتخاب تھا، اور انہوں نے سمجھوتے کے بجائے موت کا انتخاب کیا۔ سقراط کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اس نے جلاوطن ہونے یا جرمانہ دے کر زندگی بچانے کی بجائے موت کو ترجیح دی۔

وہ افراد جو اپنی شرائط پر زندہ رہنا چاہتے ہیں، اپنے اصولوں پر قائم رہنا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک مفلسی و عسرت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے نہ ہی شہرت اور معاشرے میں عزت کی اہمیت ہوتی ہے، ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے کہ جس میں وہ خوش رہتے ہیں۔ یہ بے خوف و خطر آمروں اور طاقت ور حکمرانوں کی مخالفت کرتے ہیں، اور اپنے اصولوں کی خاطر قید و بند اور موت تک کو اختیار کرنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں اس کی بھی فکر نہیں ہوتی کہ تاریخ میں ان کا ذکر ہوگا یا انہیں فراموش کر دیا جائے گا۔ کیونکہ تاریخ بھی حکمرانوں کی ہوتی ہے اس میں باغیوں کا ذکر کم ہی ہوتا ہے، اگر ہوتا بھی ہے تو بطور ملک دشمن اور غدار کے لیکن اس کے باوجود ان کا وجود باقی رہتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو آنے والی نسلوں کو متاثر کرتے ہیں، انہیں حوصلہ دیتے ہیں، ان میں جرأت و ہمت پیدا کرتے ہیں انہیں اس مشکل راستہ سے نپٹنے کا سبق دیتے ہیں۔ ان کی آواز دبائی نہیں جاتی ہے جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ ابھرتی رہتی ہے۔

کسی قوم میں ایسے منحرفین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اور کہیں کم، لیکن ایسے افراد ہر معاشرے میں ضرور ہوتے ہیں۔

مفکرین اور دانشور معاشرے میں اخلاقی اقدار کے تضاد اور ان پر عمل درآمد پر زور دیتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کمزور اور زیردست لوگوں کے حقوق کی حفاظت ان ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اخلاقی اقدار کے دباؤ کی وجہ سے طاقت ور اور اہل اقتدار طبقوں کو جبر، ظلم وستم سے روکا جاسکتا ہے۔ قانون کی بالادستی ہے کہ جو ہر طبقے کو ایک سطح پر لے آتی ہے اور یوں معاشرے میں ہم آہنگی اور امن وامان کو قائم رکھنے میں مدد دیتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس جب یہ کہا جائے کہ سیاسیات، معیشت اور تاریخ کو اخلاقی قدروں سے آزاد کر دیا جائے اور ان کے عمل کو حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو پھر اہل اقتدار اور طاقت ور طبقوں کا جبر اور بدعنوانی کو جواز مل جاتا ہے کہ انہیں حالات کے تحت اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کرنا ہے، اور کامیابی کے حصول کے لئے ہر طریقہ کار کو اختیار کرنا درست اور صحیح ہے۔

اگر تاریخ کو اخلاقی قدروں سے آزاد قرار دے کر اس کا مطالعہ کیا جائے تو پھر ہر آمر، اور مطلق العنان حکمراں اپنے مخالفوں کو قید کر کے، اذیت دینے اور جان سے مارنے کو درست اقدام کہے گا کیونکہ یہ اس کی حکمرانی کے لئے ضروری ہے۔ اس کو Pragmatic پالیسی کہا جائے یا حقیقی سیاست (Real Politics)، یہ اخلاقی اقدار کی خلاف ورزی ہے اس لئے اگر اس پر عمل کرنے والے کامیاب کیوں نہ ہوں، تاریخ میں انہیں مجرم ٹھہرانا چاہیئے۔ تاریخ کی اس سزا سے شاید آنے والے اس پالیسی سے دور رہیں۔ اگر دور نہ ہوں تب بھی انہیں مجرموں کی صفت میں شامل کر کے انہیں سزا دینی چاہیئے۔

تاریخ انسانی فطرت کو پوری طرح سے ظاہر کرتی ہے۔ مفکرین میں اس پر بحث ہے کہ کیا انسان فطرتاً نیک ہے یا شر اور فساد کا مظہر ہے؟ تاریخ کے مطالعہ سے ہم پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب انسان کے پاس طاقت اور اختیارات ہوں تو اس کی فطرت کچھ اور ہوتی ہے۔ اس میں رعونت، خشونت، ظلم اور جبر کے جذبات پوری طرح سے ابھر کر آتے ہیں۔ لیکن جب وہ بے اختیار اور بے بس ہوتا ہے تو اس کی فطرت میں عاجزی اور انکساری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا تعلق فردِ واحد

سے ہی نہیں بلکہ قوموں سے بھی ہوتا ہے۔

جب ایک قوم طاقت ور ہوتی ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بالا دستی کو تسلیم کیا جائے۔ اس کی اطاعت کی جائے، اور اس کے احکامات پر عمل کیا جائے۔

تاریخ میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً ایتھنز کی فوج نے ملوس (Milos) نامی جزیرے پر حملہ کیا، اور اس کے حکمرانوں سے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور ان کی اطاعت کریں۔ ملوس کے لوگوں نے کہا کہ ہم نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ اس لئے تمہارا ہم پر حملہ ناجائز ہے، اس پر ایتھنز کے جنرل نے کہا کہ فطرت کا یہ قانون ہے کہ کمزور طاقت ور کی یا تو اطاعت کرتا ہے یا اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ہم طاقت ور ہیں اور تم کمزور ہو، اس لئے ہمارا حق ہے کہ تم پر حکومت کریں۔ اگر تم مزاحمت کرو گے تو اس کی سزا موت ہے۔

ملوس کے لوگوں نے مزاحمت کی اور شکست کھائی۔ اس کے نتیجہ میں اس کے مردوں کو قتل کر دیا گیا، اور اس کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔

ایک دوسری مثال رومی سلطنت اور کارتھیج کی لڑائی ہے جو تاریخ میں پیونک (Punic) جنگیں کہلاتی ہیں۔ کارتھیج موجودہ تیونس میں واقع تھا اور اس کی آبادی فونیقی تھی جو تجارت میں ماہر تھے۔ کارتھیج کے جنرل ہنی بال نے رومیوں کو بری طرح سے شکستیں دیں۔ اس لئے ان کا فیصلہ یہ تھا کہ اس شہر کو مسمار کر دیا جائے تا کہ اس سے روم کو جو خطرہ ہے وہ ختم ہو جائے۔

ہنی بال کو رومی جنرل سسی پیو افریکانس (Saci Pio Africanus) نے ذیما (Zema) کی جنگ میں شکست دی، مگر اس نے کارتھیج کو مسمار نہیں کیا۔ لیکن رومی سینٹ اس سے مطمئن نہیں تھی اور کارتھیج کی تباہی چاہتی تھی۔ آخر کار سسی پیو کے پوتے نے اس کام کو سر انجام دیا۔ مورخ اس کو اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ اہل کارتھیج نے جب کامیابی کی امید نہیں دیکھی تو صلح کی درخواست کی۔ اس پر یہ شرائط عائد کی گئیں کہ وہ سینیٹرز کے 25 لڑکوں کو بطور یرغمال رومیوں کے حوالے کریں۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اپنے تمام ہتھیار ان کے حوالے کر دیں، اور آخر میں یہ شرط عائد کی کہ شہر کو خالی کر دیا جائے۔ اس پر اہل کارتھیج کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے قلعہ کے دروازے بند کر کے اپنے دفاع کا اعلان کر دیا۔ سخت مزاحمت کے بعد بالآخر ان کو شکست ہوئی اور رومیوں نے مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا اور شہر کو آگ لگا دی۔ جب شہر جل رہا تھا تو

سسی پیو نے پولی بیس (Polybious) جو مورخ تھا، اس سے کہا کہ ہم نے کارتھیج کو تو جلا دیا ہے کیا کسی دن یہی حشر روم کا بھی ہوسکتا ہے۔

اور ہوا بھی یہی، 5 ویں صدی عیسوی میں جرمن قبائل نے رومی سلطنت پر حملے کئے، اور انہوں نے روم کے شہر پر قبضہ کر کے اسے لوٹا۔ سیاسی طاقت کے زوال کے ساتھ روم کا شہر بھی اجڑ گیا۔ اس کے کلوزیم میں جھاڑیاں اُگ آئیں۔ اس کے محلات، مندر اور مقبرے شکستہ و خستہ ہوگئے۔ شہر عبرت کا ایک نمونہ ہوگیا۔ کہاں اس کی شان و شوکت، اور سرگرمیاں تھیں اور کہاں اب ویرانی اور خاموشی۔

مگر انسان تاریخ سے سیکھتا نہیں ہے۔

طاقت ور آج بھی کمزوروں کو مجبور کرتا ہے کہ اس کی بالادستی کو تسلیم کیا جائے۔ اس کی مخالفت، جنگ اور تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ قوموں کا عروج و زوال ہوتا رہتا ہے، اس گردش میں افراد قربانی دیتے رہتے ہیں اور اپنی زندگیاں قربان کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ان قربانیوں کے نتیجہ میں حکمراں عظمت کے تاج پہن لیتے ہیں اور تاریخ میں عظیم بن جاتے ہیں۔

افلاطون ڈائی لاگ میں، جب ایک سوفسٹ سقراط سے کہتا ہے کہ انصاف طاقت کا نام ہے۔ تو سقراط اس کی مخالفت کر کے اسے نیکی سے تشبیہ دیتا ہے مگر حقیقت تو یہی ہے کہ جس کے پاس طاقت ہے، اس کا عمل انصاف پر مبنی ہو جاتا ہے۔ کمزور لوگ اپنے تحفظ کے لئے اخلاقی اقدار کا سہارا لیتے ہیں، طاقت ور کو اخلاقی اقدار کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ طاقت اس کے ہر قدم کو اخلاقی بنا دیتی ہے۔

تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ جو شکست کھا جاتا ہے، اس کو تاریخ بھلا دیتی ہے۔ رومی تاریخ میں جولیس سیزر کے کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ایک عظیم جنرل کہ جس نے فتوحات کے ذریعہ رومی بالادستی کو قائم کیا اور خود طاقت و دولت دونوں حاصل کیں۔ اس کو عظیم بناتے وقت مورخ اس کی قتل و غارت گری اور ظلم و جبر کو بھول جاتے ہیں۔ اس کی طاقت اور سیاست میں اس کی حکمت عملی تھی کہ جس نے اس میں اس خواہش کو پیدا کیا کہ وہ رومی سلطنت میں مکمل اختیارات لے کر رومی جمہوریت کو ختم کردے۔

اس لئے روم میں دو گروہ بن گئے۔ ایک وہ جو سیزر کو بااختیار اور شہنشاہ بنانا چاہتے تھے۔

دوسرے وہ جو کہ روم کا قدیم جمہوری روح کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اس لئے سیزر کا قتل، جمہوریت پسندوں کا فیصلہ تھا کہ وہ روم کو آمریت اور مطلق العنانیت سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

مگر ہوا یہ کہ سیزر کے حامیوں کے پاس زیادہ فوجی طاقت تھی، اس لئے مارک انٹونی اور اکٹووین (Octovian) نے مل کر سیزر کے قاتلوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکٹووین نے تمام اختیارات حاصل کر کے شہنشاہیت کا روپ اختیار کر لیا۔ شہنشاہیت کے اس دور میں کسی کی ہمت نہیں تھی کہ سیزر کے قاتلوں کی تعریف کرے، یا ان کے اقدام کو جمہوری رُوح کو زندہ رکھنے والا کہے۔ ان کو رومی تاریخ میں کوئی باعزت جگہ نہیں ملی۔

اسی طرح سے سیزر کی زندگی ہی میں اس کے عزائم کی مخالفت کرنے والا کیٹو (Cato) تھا، جس نے سیزر کی طاقت اور اثر کے باوجود سینٹ میں اس کی مخالفت کی، اور یہ مخالفت زبانی ہی نہیں رہی، اس نے فوجی طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ مگر جب اس کو شکست ہوئی، تو اس نے معاہدہ یا سمجھوتہ کرنے کے بجائے، مرنا قبول کیا۔

زندگی کی آخری رات کو کھانے پر اس نے اپنے بیٹے سے روح کی لافانیت پر بحث کی، اور دلیل دی کہ اس دنیا میں نیکی اور بھلائی پر اس لئے قائم رہنا چاہئے کہ اس سے روح پاکیزہ ہوتی ہے۔ رات کو سوتے وقت اس نے تلوار اپنے تکیے کے نیچے رکھی۔ مگر جب وہ گہری نیند سوئے ہوئے تھا تو اس کا ملازم یہ تلوار لے گیا۔ صبح جب اس نے تلوار نہیں دیکھی تو ملازم پر سخت غصہ ہوا۔ اس نے تلوار مار کر خودکشی کرنی چاہی۔ لڑکے نے ڈاکٹر کو بلا کر زخموں پر ٹانکے لگوائے مگر اس نے یہ ٹانکے کھول دیئے اور خون کے بہنے سے مر گیا۔ رومی تاریخ نے اس کے کردار کو نظرانداز کر دیا۔

مگر اب جب کہ رومی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ تاریخ سیزر کے قاتلوں اور کیٹو کو ان کا باعزت مقام دے رہی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے جمہوریت کی خاطر جانیں دیں۔ آمریت کے خلاف جدوجہد کی اگرچہ وہ ناکام رہے مگر آج تاریخ ان کو یاد کر رہی ہے اور ابھار رہی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو انسانوں کو روشنی دکھانے والے ہیں۔

یہ منحرف اور باغی لوگ جو آمروں اور مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ان کے پیش نظر ان کا جبر، ظلم اور استحصال ہوتا ہے یہ اس کے مقابلہ میں لوگوں کی آزادی اور معاشرے کی خوش حالی کی بات کرتے ہیں۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ بغاوت اور مخالفت میں یہ اکیلے رہ جاتے ہیں۔ حکمرانوں کے لئے یہ آسان ہوتا ہے کہ ان کی آواز کو دبا دیں۔ انہیں اذیت دے کر ان کو مجبور کر دیں کہ یہ خاموش ہو جائیں۔ قید و بند کی صعوبتوں سے ان کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور اگر بات زیادہ بڑھ جائے تو انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس سارے عمل میں معاشرہ خاموش تماشائی بنا یہ سب دیکھتا ہے اور ان کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔

اس کے بعد سرکاری تاریخوں میں یہ باغی، شرپسند، غیر ملکی ایجنٹ اور فتنہ وفساد پیدا کرنے والے ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں ان کا یہ عکس لوگوں کو بھی اس نقطہء نظر کا ہمنوا بنا دیتا ہے۔

اس سے بڑھ کر افسوس ناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ اکثر انہیں تاریخ سے بالکل غائب کر دیا جاتا ہے۔ ایسے جیسے ان کا وجود ہی نہیں تھا، اور آنے والی نسلیں انہیں بھول جاتی ہیں۔

کبھی یہ ہوتا ہے کہ وقت کے گزرنے اور حالات کے تبدیل ہونے کے بعد ان کی ضرورت پڑتی ہے تو اس وقت تاریخ کی گمنامی سے انہیں باہر نکال کر ان کی شخصیت کو ابھارا جاتا ہے۔ جس کی ایک مثال اسپارٹاکس (Spartacus) جس نے رومیوں کے عہد میں غلاموں کی بغاوت کی سربراہی کی تھی۔ موجودہ زمانے میں جب سوشل ازم نے مزدوروں، کسانوں اور زیردست طبقوں کے حقوق کی بات کی تو پھر تاریخ سے اسپارٹاکس کو لایا گیا جو ان طبقوں کی جدوجہد میں ہیرو بن کر ابھرا۔ ہمارے ہاں ایسے بہت سے منحرف لوگ ہیں کہ جنہوں نے فوجی آمریتوں کے خلاف آواز اٹھائی اور جانیں دیں مگر اب تک ان کی پہچان ایک محدود طبقے میں ہے، اکثریت ان سے بیگانہ ہے حسن ناصر، نذیر عباسی، ان میں سے چند ہیں۔ ایم۔ آر۔ ڈی کی تحریک میں کتنے لوگ اذیت وقید و بند سے گزرے، ان کے بارے میں تاریخ خاموش ہے اور معاشرہ بھی انہیں بھول گیا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، مگر اس کے باوجود منحرف لوگوں کی آواز بھی اٹھتی رہتی ہیں، ان کو دبایا نہیں جا سکتا کیونکہ جو افراد یہ آواز بلند کرتے ہیں نہ تو انہیں لوگوں میں مقبولیت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی یہ خواہش کہ ان کا نام تاریخ میں محفوظ ہو جائے۔ ان کی آواز ان کے شعور کی پیداوار ہوتی ہے، وہ اپنے ضمیر کی اس آواز کو بلند کرتے ہیں۔ شعور اور ضمیر کا یہ احساس انہیں اس قدر توانائی، طاقت اور قوت دے دیتا ہے کہ پھر وہ کسی جابر، ظالم اور اس کے

حواریوں سے نہیں ڈرتے ہیں۔ اذیت وقید و بند ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ اگر انہیں موت کی سزا دیدی جائے تو وہ اسے بخوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ اس موت میں ان کے عزائم اور ارادوں کی تکمیل ہوتی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مورخ کو گمشدہ دستاویزات میں ان افراد کے بارے میں معلومات مل جاتی ہیں، تو ان سے کوئی ایک آدھ مضمون شائع کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ ذاتی، مذہبی، اور لسانی تعصبات کا بھی شکار ہوتی ہے، اور انہیں جذبات کے ساتھ اسے لکھا جاتا ہے۔ انگریزوں کے دور میں 1857 کو غدر کہا جاتا رہا۔ وہ تمام لوگ کہ جنہوں نے ان کے خلاف جنگیں لڑیں غدار کہلاتے رہے۔ آزادی کے بعد تاریخ کا یہ نقطۂ نظر بدلا، اور غدار ہیرو بن گئے، اور انگریزوں کے حامی غدار کہلائے۔ مگر اس تاریخ نویسی میں بھی کمی رہی، جھانسی کی رانی کی شخصیت کو تو ابھارا گیا، مگر بیگم حضرت محل کو وہ جگہ نہیں ملی کہ جس کی وہ مستحق تھیں۔ وہ آخر وقت تک انگریزوں سے لڑیں، اور آخر میں نیپال چلی گئیں کہ جہاں مرتے دم تک رہیں۔ اسی طرح ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر، اور سراج الدولہ کی شخصیت کو انگریزوں نے جس طرح سے مسخ کر کے پیش کیا ہے، اس کو صاف کرنے میں کافی وقت لگے گا۔

تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ اس میں قوموں کے عروج وزوال کو ان کی فتوحات یا شکستوں کے عمل میں دیکھا جاتا ہے۔ جب فتوحات ان کے عروج کا مظہر ہوتی ہیں، تو اس صورت میں جنرل، سپہ سالار اور فوجی سربراہ ہیرو بن جاتے ہیں اور ان کی بہادری، شجاعت اور جواں مردی کے قصے لوگوں میں مشہور ہو جاتے ہیں۔ جب فتوحات کا پہیہ رک جاتا ہے تو اسے قوموں کے زوال سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ فتوحات کے نتیجہ میں ہزارہا لوگوں کا قتل عام ہوا۔ شہروں کو تباہ و برباد کیا گیا اور عام لوگوں کو جو اس تمام عمل میں شریک نہیں تھے، انہیں یا تو قتل کیا گیا، یا غلام بنایا گیا۔ سکندر کو محض اس لئے اعظم کہا جاتا ہے کہ اس نے دنیا کے بڑے حصے کو فتح کیا۔ قتل و غارت گری اور خوں ریزی کی بنیاد پر عظیم کہنا زبردست مذاق ہے۔

سیزر نے جب گال پر حملہ کیا تو دس لاکھ گال مارے گئے، دس لاکھ کو غلام بنایا گیا۔ ایک جنگ کے بعد رومی ساٹھ ہزار لوگوں کو غلام بنا کر لائے۔ ان جنگوں کی سب سے زیادہ قیمت عورتوں کو ادا کرنی پڑی جنہیں کنیزیں بنا کر تقسیم کیا جاتا تھا اور پھر ان کا جنسی استحصال ہوتا تھا۔

قدیم اور عہد وسطیٰ کی جنگوں میں کسانوں کو بھرتی کیا جاتا تھا۔ یہ جنگیں، حکمرانوں اور حکمراں طبقوں کے مفادات کو پورا کرنے کے لئے ہوتی تھیں۔ ان میں زمینوں پر قبضہ کرنا اور دوسروں کے مالی ذرائع کو حاصل کرنا ہوتا تھا۔ مگر عام لوگوں میں جذبہ پیدا کرنے کی خاطر کبھی انہیں مذہبی جنگیں کہا جاتا تھا اور کبھی یہ قوم کی عظمت کی خاطر لڑی جاتی تھیں۔

جدید دور میں یورپ کے امپیریل ازم نے ان جنگوں کو تہذیب، جمہوریت اور لبرل ازم کے نام پر اپنے لوگوں کو ابھارا۔ لیکن عام فوجیوں کے لئے یہ نعرے محض دلفریب تھے، وہ ان سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ حال ہی میں کچھ مورخوں کو ان خطوط کی روشنی سے پتہ چلا ہے کہ محاذ پر رہتے ہوئے فوجیوں کو قطعی اس جذبہ کا احساس نہیں تھا کہ وہ وطن، قوم، یا تہذیب کے لئے لڑ رہے ہیں۔ انہیں موت کا خوف تھا، اور یہ خوف تھا کہ وہ زخمی ہو کر اپنے ہاتھ اور پیر سے محروم نہ ہو جائیں۔ وہ ان زخمی ساتھیوں کو دیکھ رہے تھے کہ جو زخمی ہو کر ایک اذیت کا شکار تھے۔ یہ فوجی خندقوں میں ہی نہیں مر رہے تھے بلکہ زخموں سے ہسپتالوں میں بھی جان دے رہے تھے۔ اس ماحول میں وہ کسی عظیم مقصد کے لئے جان دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے جو کہا جاتا ہے کہ عام فوجی توپوں کی غذا (Cannon Fodder) تھے تو یہ صحیح تھا۔ جنگ میں اس سے زیادہ ان کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ جان دیدیں، اور پھر قوم انہیں فراموش کر دے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں جب برطانیہ کو توپوں کے لئے غذا چاہئے تھی تو انہوں نے خاص طور سے پنجاب سے لوگوں کو زبردستی بھرتی کیا۔ جب یہ نازک وقت آیا تو انہیں مارشل قوموں کے منشور کو بھی ایک طرف رکھنا پڑا، اور فوجیوں کے لئے جو شرائط تھیں کہ ان کا قد اس قدر ہو، اور سینہ اتنا چوڑا ہو، یہ سب چھوڑنا پڑا۔ گاؤں میں نوجوانوں کو بھرتی کرانے کا کام پنجاب کے جاگیرداروں نے کیا۔ نوجوان بھرتی کے خوف سے روپوش ہو جاتے تھے یا خود کو زخمی کر لیتے تھے۔ ہمارے شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اس بھرتی کی مہم میں ایک گیت لکھا تھا کہ جس کا مصرع تھا ''میں چھورے کو بھرتی کرا آئی رے'' یہ نوجوان جو یورپ کے محاذ پر گئے اور مارے گئے، ان بے نام فوجیوں میں ہیں کہ جن کا کوئی ذکر نہیں۔

اہل یورپ نے اپنے فوجیوں کی یادگاریں تعمیر کیں، ان کے قبرستان بنائے، مگر ہندوستان کے یہ فوجی اَن جانی قبروں میں سوئے ہوئے ہیں۔ امپیریل ازم نے ان کی

قربانیوں کو یاد نہیں کیا۔

جنگ کی تمام تباہ کاریوں اور خوں ریزی کے باوجود آج بھی جنگ کو قومیں اپنے مسائل کا حل سمجھتی ہیں۔ اس میں تاریخ کا بھی قصور ہے کہ جو جنگوں کو عظیم بنا کر پیش کرتی ہے اور لوگوں کو ان کے مقاصد سے آگاہ نہیں کرتی ہے۔ یہ جنگیں کبھی بھی عام لوگوں کے مفاد میں نہیں ہوئیں، عام لوگ قربان گاہ پر چڑھائے گئے۔

تاریخ اس وقت افسردہ کر دیتی ہے، جب ہم اس میں غلاموں، کسانوں اور عورتوں کی زندگی کے بارے میں پڑھتے ہیں۔ غلامی کے اداروں نے انسانیت کو مجروح کیا اور انسانوں کی قسمت پر مہر لگا دی کہ وہ اس دنیا سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ہر غلام زندگی کے ہر شعبہ میں کام کرتے تھے، کان کنی کی زندگی سب سے زیادہ اذیت ناک تھی کہ جہاں 18، 17 گھنٹے یہ کانوں کے اندر رہ کر تانبا، چاندی اور دوسری معدنیات نکالتے تھے۔ اس لئے ان کی زندگی مختصر ہوتی تھی، محنت و مشقت، کم خوراک، اور ماحول کی گھٹن انہیں جلد ہی اس دنیا سے نجات دلا دیتی تھی۔

کھیتوں میں کام کرنے والے اگرچہ کھلی فضا میں کام کرتے تھے، مگر یہاں بھی زندگی ان کے لئے وبال جاں تھی۔ گھریلو غلام علیحدہ سے ہوتے تھے۔ اس ادارہ کو معاشرے میں جائز اور درست تسلیم کر لیا گیا تھا۔

یہی حال کسانوں اور ہاریوں کا تھا، جو محنت و مشقت کر کے فصلیں تیار کرتے تھے جن سے انہیں بہ دِقت کھانے کو ملتا تھا۔ عورتوں کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی، نہ ہی انہیں آزادی نصیب تھی۔ ہزاروں سال ان کا استحصال ہوتا رہا ہے۔ اس استحصال کو جواز دینے کے لئے مذہبی اور سماجی راویات کا سہارا لیا گیا۔ مفکروں، فلسفیوں، اور دانشوروں نے اس کو جائز قرار دیا۔ اگرچہ کبھی کبھی کسی کی آواز اٹھتی رہی، مگر یہ آوازیں دبادی گئیں۔

لیکن دوسری جانب تاریخ کا روشن پہلو ہے کہ انسان کو چاہے جس قدر دبایا جائے، اس پر ظلم کیا جائے، پابندیاں عائد کی جائیں، ڈرایا اور خوف زدہ کیا جائے، مگر اس میں اپنے حق کے اصول کے لئے مزاحمت اور بغاوت کا جذبہ ختم نہیں ہوتا ہے اور وہ برابر طاقت کے خلاف اٹھتا رہتا ہے، غلام، اور کسان برابر بغاوتیں کرتے رہے۔ اگرچہ انہیں احساس

تھا کہ ان کی بغاوتیں ناکام ہوں گی، مگر حقوق کے حصول کے لئے انہوں نے جدوجہد کی اور تاریخ میں اضافہ کر گئے۔

یہ سبق ہے، آمروں، مطلق العنان حکمرانوں اور طاقت کے متوالوں کے نام کہ جب نہتے اور اسلحہ سے محروم لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ ہر رکاوٹ کو دور کرتے ہیں اور ہر طاقت کو بکھیر دیتے ہیں۔ تاریخ کا یہ وہ پہلو ہے جو محروم طبقوں اور بے بس عوام کو حوصلہ دیتا ہے کہ تبدیلی ان کے حق میں آئے گی۔

ہندوستان سے روابط

1952ء میں ہندوستان سے پاکستان آنا ہوا، تو اس وقت تک میں نے سوائے ٹونک کے اور کوئی دوسرا شہر نہیں دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ چاکسو جانا ہوا تھا، وہاں والد کے ایک ہندو دوست کی شادی تھی۔ واپسی میں ٹرین سے شاید نوائی تک آئے تھے، یہ میرا ٹرین میں پہلا سفر تھا۔ پاکستان میں آنے کے بعد زندگی کی مشکلات شروع ہو گئیں اور میں حیدرآباد سندھ کا ہو کر رہ گیا۔

میری والدہ دو مرتبہ ہندوستان گئیں، جہاں ان کے بھائی بہن اور ماں وہیں رہ گئے تھے۔ یہ 1960ء سے پہلے کی بات ہے اس وقت تک آنے جانے میں کوئی شرائط نہیں تھیں، پاسپورٹ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی، کھوکھراپار اور بعد میں لاہور کے راستے آنا جانا ہوتا تھا۔ میری والدہ ایک مرتبہ شاید کھوکھراپار اور دوسری مرتبہ لاہور کے راستے سے گئیں۔ دوسری مرتبہ وہ کوئی سات مہینے وہیں رہیں، جب آنا ہوا تو آرام سے آ گئیں۔ اس وقت تک خط و کتابت بھی ہوتی تھی، مجھے یاد ہے پتہ بھی اردو میں لکھا جاتا تھا۔ ہندوستان سے فلمیں، اخبارات اور رسالے آتے رہتے تھے۔ مشاعروں میں شاعروں کا برابر آنا جانا ہوتا تھا۔ جگر مرادآبادی جب پاکستان آتے تو حیدرآباد سندھ کے مشاعروں میں شرکت ضرور کرتے تھے۔ ملک تقسیم ہو گیا تھا، مگر ابھی زخم اتنے گہرے نہیں تھے۔ دونوں جانب سے لوگوں کے تعلقات جاری تھے۔

میں دونوں مرتبہ والدہ کے ساتھ نہیں گیا اور تعلیم کی وجہ سے حیدرآباد میں ٹھہرا رہا۔

میرے ماموں صرف ایک مرتبہ پاکستان آئے، اس وقت تک حالات بدل چکے تھے۔ پاسپورٹ اور ویزا لازمی ہو گئے تھے۔ ان کے لئے پاسپورٹ بنوانا، اور پھر دہلی میں جا کر ویزا لینے کا مرحلہ تھا، بہرحال وہ آخری بار ہم سب سے ملنے آئے، جس کے بعد نہ تو والدہ کا جانا ہوا، اور نہ ہی ان کا آنا۔ میں نے 1991ء میں والدہ کی وفات کا انہیں خط لکھا تھا، جس کا کوئی جواب نہیں

آیا۔ پھر کسی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ وہ بھی انتقال کر گئے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے ان کے جانے کے بعد ہمارا یہ آخری رشتہ بھی ختم ہو گیا۔

1996ء میں جب میرا ہندوستان جانا ہوا تو میں ٹونک بھی چلا گیا۔ 1952ء کے بعد یہ میرا پہلا سفر تھا جو اپنے پرانے وطن کے لئے کیا تھا۔ میں سب سے پہلے اپنے ماموں کی حویلی میں گیا، اب یہ بالکل خالی تھی، معلوم ہوا کہ ممانی جان کے انتقال کے بعد وہ بالکل تنہا ہو گئے تھے۔ اس صدمہ میں وہ اس جہان سے گزر گئے۔

میں جب حویلی میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ شاید اسے اسکول میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ مگر اس وقت یہ بالکل ویران تھی۔ میرا بچپن اس جگہ گزرا تھا اس لئے میں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور اس ویرانی کو اپنی یادوں کے ذریعہ آباد کرنا چاہا کہ یہاں نانی بیٹھتی تھیں۔ وہاں سامنے ممانی جان کھانا پکانے میں مصروف رہتی تھیں۔ مگر میں زیادہ دیر اس کو آباد نہیں رکھ سکا۔ اپنے آپ کو اسی خاموشی اور ویرانی میں پایا، دل بیٹھ گیا، اور سوچنے لگا یہ دنیا عجیب ہے مکان رہ جاتے ہیں اور مکین چلے جاتے ہیں۔ ان سطروں کو لکھتے ہوئے دل افسردہ ہو گیا ہے۔ میں سوچتا ہوں ہم نے تقسیم کی کتنی بڑی قیمت ادا کی ہے۔

1963ء میں، سندھ یونیورسٹی میں ملازمت شروع کی۔ 1965ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات انتہائی خراب ہو چکے تھے۔ جنگ نے نہ صرف دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے دور کیا بلکہ لوگ بھی ایک دوسرے سے اجنبی ہوتے چلے گئے۔ اب ہندوستان جانے کے راستے بند ہو چکے تھے۔

یونیورسٹی کی ملازمت کی وجہ سے اب اگر غیر ملک کا سفر کرنا ہو تو حکومت سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ لہٰذا اب ہندوستان کا سفر ناممکن ہو گیا تھا۔ میں نے شاید 1977ء میں اجازت مانگی جو نہ ملی، اس کے بعد سے یہ ارادہ ہی ختم ہو گیا کہ ایک بار اپنا گھر جا کر دیکھ لیا جائے۔

یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اب اگر ہندوستان یا کسی اور غیر ملک جانا ہو تو حکومت سے اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ 1992ء میں جب میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور کا ڈائریکٹر ہوا تو ہندوستان اور پاکستان کے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ نے مل کر یہ پروگرام بنایا کہ قوم پرستی اور قومی شناخت پر سیمینار ہو، جس کا ایک سیشن کراچی میں ہو اور

دوسرا بنگلور میں۔ چونکہ مجھے بھی اس سیمینار میں مقالہ پڑھنا تھا، اس لئے ہندوستان کے ویزے کے لئے درخواست دینی تھی۔

شاہد کاردار کو بھی اس سیمینار میں شرکت کرنی تھی، چونکہ ان کا اسلام آباد میں جانا ہوتا رہتا تھا، میں نے اپنا پاسپورٹ بھی ان کے حوالے کیا کہ اپنے ساتھ وہ میرا ویزا بھی لے آئیں۔ خیال تھا کہ چونکہ اس میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کا عمل دخل ہے ویزا ملنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ یہ ہماری خوش فہمی تھی۔ ایک یا دو دن بعد شاہد کاردار کا اسلام آباد سے فون آیا کہ پہلے تو ویزا افسر نے بغیر کسی سوال جواب کے ہمیں ویزا دے دیا، مگر تھوڑی دیر بعد نہ جانے کیا خیال آیا، میرے ہاتھ سے پاسپورٹ لئے اور ویزا رد کر دیا۔ میں نے سوچا کہ 1952ء کے بعد ہندوستان جانے کا یہ موقع تھا جو کھو دیا۔

کراچی کے سیشن میں ہندوستان سے بپن چندرا اور ذویا حسین تھیں، یہ دونوں جے۔ این۔ یو میں پڑھاتے تھے۔ بپن چندر کی کتابیں میں پڑھ چکا تھا، اس لئے ان سے متاثر تھا۔ کراچی کے سیشن میں ہندوستانی قونصل آفتاب سیٹھ بھی آئے۔ اس موقع پر کراچی کے ڈائریکٹر شیر ر نے ان سے کہا کہ اسلام آباد کے ہندوستانی سفارت خانے نے ہمارے ویزے رد کر دیئے، اس پر آفتاب سیٹھ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، وہ ہمیں کراچی سے یہ ویزے دیدیں گے۔ انہوں نے ایمرجنسی میں قونصل خانہ کھلوایا اور مجھے، شاہد کاردار کو ویزا دیدیا۔

یوں ہندوستان جانے کا پہلا موقع مل گیا۔

کراچی سے جہاز بمبئی پہنچا، تو ائیرپورٹ پر مجھے علیحدہ کر دیا گیا۔ پاکستانیوں کے لئے ایک اور فارم بھرنا ہوتا ہے جو وہاں کی سی۔ آئی۔ ڈی کے لئے ہوتا ہے کہ آپ کہاں ٹھہرے ہیں اور کون آپ کا میزبان ہے۔ بمبئی میں عصر تک رکنا تھا۔ اس کے بعد بنگلور کی فلائٹ تھی۔ لہٰذا اس عرصہ میں بمبئی کی سیر کی اور لنچ تاج محل ہوٹل میں کھایا، یہاں ایف۔ ایم۔ حسین کی ایک بڑی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ بنگلور پہنچے، دوسرے دن سیمینار تھا، اس میں ہندوستان سے اور اسکالرز شریک ہوئے، ان میں اشیش نندی بھی تھے جو ایک اچھے اسکالر کے ساتھ ساتھ، زندہ دل انسان بھی ہیں۔ ان سے اس وقت واقفیت ہوئی تو وہ اب تک ہے، جب بھی دلی یا دوسرے شہر میں ملتے ہیں تو بڑے تپاک سے اور لگاؤ کے ساتھ۔

سیمینار کے بعد ایک دن خالی تھا، اس میں جسٹس فخرالدین جی ابراہیم کے ساتھ شہر دیکھنے کو نکل گئے۔ بنگلور اچھا اور صاف ستھرا شہر ہے۔ ہم نے یہاں لال باغ اور مندر کے علاوہ ٹیپو سلطان کا سرما کا محل دیکھا۔ یہ ایک سادہ سی عمارت ہے اس میں ٹیپو اور انگریزوں کے ساتھ ہونے والی جنگوں کی پینٹنگز ہیں، وہاں ہمارے علاوہ دوسرے غیر ملکی سیاح بھی تھے، گائڈ ان سے کہہ رہا تھا، ہمارے ٹیپو سلطان نے انگریزوں سے مقابلہ کیا اور بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ جنوبی ہند کے لوگوں میں ٹیپو کی کس قدر عزت ہے۔ بدقسمتی سے انگریز مورخوں نے اس کی کردار کشی کی اور اسے ایک متعصب مسلمان حکمراں کے روپ میں پیش کیا کہ جس نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ مذہبی لحاظ سے وہ بڑا روادار تھا اور اس کی ملازمتوں میں بڑے عہدوں پر ہندو فائز تھے۔ اسی وجہ سے جنوبی ہند میں اس کے بارے میں ایک اچھے حکمراں کے تاثرات ہیں۔

بنگلور میں ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ اشیش نندی نے کہا کہ چونکہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس اس کی کتابیں شائع کرتا ہے، لہٰذا وہ ہمیں رعایت کے ساتھ کتابوں کی خریداری کروادے گا۔ دکان میں جا کر میں نے دو یا تین کتابیں پسند کیں اور انہیں لے کر کاؤنٹر پر آیا، لڑکی نے ابھی رسید بنانا شروع کی تھی کہ شیر رآٹھ، دس کتابیں لے آیا، لڑکی نے میری کتابیں ایک طرف کیں اور پہلے اس کے لئے رسید تیار کرنے لگی۔ میں نے سوچا کہ یہ کولونیل ازم کا اثر ہمارے یہاں اور ہندوستان دونوں جگہ ہے۔ گوروں کو دیکھو، پہلے ان کی خدمت کی جاتی ہے۔ میں نے کتابیں وہیں چھوڑیں اور احتجاجاً دوکان سے باہر آ گیا۔

ہم نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ واپسی دہلی کے راستے سے ہوگی، کیونکہ میرا یہ پہلا سفر تھا اس لئے میں دہلی ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ جب ہم دہلی کے لئے جانے والے تھے کہ بنگلور کے ایک ساتھی نے کہا کہ اب آپ شمالی ہندوستان جا رہے ہیں، وہاں آپ جنوب اور شمال کے فرق کو دیکھ سکیں گے۔ بنگلور میں ہمارا تجربہ یہ تھا کہ یہ شہر بڑا پُرامن ہے، لوگ خاموش اور آہستہ سے بولنے والے ہیں، شہر میں غل غپاڑہ یا لڑائی جھگڑا بھی نظر نہیں آیا، اس لئے ایک اچھا تاثر یہاں سے لے کر چلے۔

دہلی کے سفر میں، بپن چندر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے جے۔ این۔ یو کے گیسٹ

ہاؤس میں میرے اور شاہد کاردار کے رہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ ائیر پورٹ پر جے۔ این۔ یو کی ٹیکسی ہمیں لینے آئی۔ جب ہم چلے تو راستے میں ایک جگہ ٹریفک سگنل پر سرخ لائٹ تھی۔ ڈرائیور نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اور کوئی گاڑی آتے ہوئے نظر نہیں آئی تو اس نے سرخ لائٹ کی پرواہ کئے بغیر کار گزار دی۔ اس پر شاہد کاردار نے کہا کہ معلوم ہو گیا کہ ہم جنوب سے شمال میں آ گئے ہیں۔

دوسرے روز ناشتہ کر کے میں اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ راستہ میں اصغر علی انجینئر مل گئے۔ ان سے میری پہلی ملاقات 1986 میں کراچی میں ہوئی تھی جہاں وہ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کرنے آئے تھے۔ میں باتیں کرتا ہوا ان کے کمرے میں گیا تو وہاں جے۔ این۔ یو کے ایک طالب علم عبدالمعبود بیٹھے ہوئے تھے، ان سے تعارف ہوا اور یہ تعارف ایسا ہوا کہ جب بھی میں ہندوستان گیا، عبدالمعبود نے میرا چارج سنبھال لیا، گھمایا پھرایا، لوگوں سے ملاقاتیں کرائیں اور دہلی کو میرے لئے دوسرا وطن بنا دیا۔

عبدالمعبود نے کہا کہ وہ تاریخی مقامات دکھانے میں میری مدد کریں گے۔ ظاہر ہے کہ میں نے اب تک دہلی کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا، اب اشتیاق تھا کہ ان مقامات اور جگہوں کو دیکھا جائے۔ عبدالمعبود نے بتایا کہ جے۔ این۔ یو دہلی کے جنوب میں واقع ہے، یہاں سے مہرولی کا علاقہ قریب ہے کہ جہاں قطب مینار، مسجد قوت الاسلام اور دوسری عمارتیں ہیں۔ یہ علاقہ سلطنت کے عہد میں بڑا اہم تھا۔ میں نے دوسرے دن وعدے کے مطابق عبدالمعبود کا انتظار کیا، جب وہ وقت پر نہیں آئے تو میں خود چل پڑا، یونیورسٹی سے باہر نکل کر رکشہ لیا اور قطب مینار کے لئے روانہ ہوا۔

تاریخی عمارتوں کو دیکھ کر ایک عجب تاثر پیدا ہوتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عہد جو گزر گیا ہے وہ ٹھہرا ہوا، سامنے موجود ہوتا ہے، مگر اس عہد کی خستگی اور شکست خوردگی بھی ان عمارتوں میں نظر آتی ہے۔ وقت تھپیڑے لگا لگا کر ان کی عظمت اور شان و شوکت کو رَد کر دیتا ہے۔ میں نے گھوم پھر کر ان عمارتوں کو دیکھا۔ حکمراں طبقے ان عمارتوں کے ذریعہ اپنی طاقت و قوت کا اظہار کرتے ہیں تاکہ عام لوگ ان کو دیکھ کر ان سے مرعوب ہوں۔

دہلی کا یہ علاقہ اس لئے اہم ہے کیونکہ عہد سلاطین کے اولین دور میں انہوں نے یہاں یہ عمارتیں تعمیر کرائیں۔ مسجد قوت الاسلام کے نام سے ظاہر ہے کہ اس کے ذریعہ مذہبی تسلط کو ظاہر کیا

گیا ہے۔ مسجد میں مندروں کا میٹریل استعمال کیا گیا ہے اس کے ستونوں (Pillars) پر جو مورتیاں ہیں، انہیں مسخ کیا گیا ہے۔ قطب مینار، سیاسی تسلط کی علامت تھا کہ جو سطح زمین سے ابھرتا ہوا، اونچا جا رہا ہے اور دور دور تک پُرشکوہ نظارہ لوگوں میں دبدبہ اور حیرت پیدا کرتا ہے۔ فتح کی ایک علامت دروازہ ہوا کرتی تھی۔ علاء الدین کا طلائی دروازہ اس کا اظہار ہے۔ یہیں پر التمش کا مزار ہے، لہٰذا مذہبی، سیاسی اور تسلسل کی یہ علامتیں اس علاقہ میں موجود ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد میں باہر پڑی ایک بینچ پر بیٹھ گیا، صبح کا وقت تھا سیاحوں کی تعداد بہت کم تھی، ہر طرف خاموشی تھی۔ ایسے میں جب ان عمارتوں کے درمیان ماضی کے بارے میں سوچا جائے تو ایک عجب احساس ہوتا ہے۔ حکمراں چلے جاتے ہیں اور اپنی یادگاریں چھوڑ دیتے ہیں، جو شکستہ و خستہ ہو کر عبرت کا نمونہ بن جاتی ہیں۔ وقت کے ساتھ نہ تو مذہبی تسلط رہا اور نہ سیاسی، اور نہ یہ مقبرے ان کی حکمرانی کے تسلسل کو قائم رکھ سکے۔ جب وقت کے ان انقلابات پر غور کیا جائے تو دل اداس ہو جاتا ہے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد، پروفیسر ہربنس مکھیا، جو اس وقت جے۔ این۔ یو میں عہد وسطیٰ کے پروفیسر تھے، اسی علاقہ میں تغلق آباد دیکھنے کا موقع ملا۔ عام طور سے عہد وسطیٰ کے حکمرانوں کا یہ دستور تھا کہ وہ تخت نشین ہونے کے بعد اپنا محل بنواتے تھے۔ پرانے محل میں رہنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ ماضی کو فراموش کر کے اپنے عہد کی ابتداء اپنے انداز میں کرنا چاہتے تھے۔ اگر انہیں موقع ملتا تھا تو اپنا دارالسلطنت بھی نیا بناتے تھے۔ یعنی دہلی شہر کے اندر ایک اور شہر آباد کرتے تھے۔ تغلق آباد، تغلق خاندان کا دارالسلطنت تھا، اب یہ شہر کھنڈرات میں بدل چکا ہے۔ مگر جب ان کھنڈرات کے اندر سے گزرتے ہوئے ان کے ماضی کے بارے میں سوچا جائے اور تخیل کی مدد سے ان کو آباد کر لیا جائے تو آپ شہر میں آبادی کے درمیان ہوتے ہیں۔ ماضی واپس آ جاتا ہے اور کھنڈرات مکمل عمارات میں بدل جاتے ہیں۔ میں اس کیفیت میں کچھ دیر رہا اور پھر واپس آج کی دنیا میں چلا آیا۔ اس شہر سے تھوڑے فاصلہ پر محمد تغلق کا مزار ہے۔ عجیب حکمراں تھا، نئی اسکیمیں بناتا تھا، اور جب ناکام ہو تو غصہ میں آ جاتا تھا۔ ضیاء الدین برنی نے اسے مجموعہ اضداد کہا ہے۔

تغلق خاندان میں مجھے سب سے اچھا حکمراں فیروز تغلق لگتا ہے۔ اس نے اپنے عہد میں

پوری کوشش کی کہ جنگ وخوں ریزی سے دور رہے۔اس نے سب سے پہلے سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے کرائے،اور اشوک کی لاٹ کو لاکر دہلی میں نصب کرایا۔اس کے بعد آنے والے نااہل ثابت ہوئے،اور خاندان زوال کا شکار ہوا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ پروفیسر امتیاز احمد جو جے۔این۔یو میں سوشیالوجی کے پروفیسر تھے، یہاں پکنک پر آنا ہوا، میں اس علاقہ کو دیکھنے نکل گیا۔حیرت ہوئی کہ جگہ جگہ تاریخی عمارتوں کے کھنڈرات تھے۔ ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی، خاموشی تھی، درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان کوئی مقبرہ یا کوئی عمارت نظر آجاتی تھی۔

مہرولی ہی میں قطب الدین بختیار کاکی کا مزار ہے، میں نے سوچا کہ یہ تاریخی شخصیت تھے، ان کے مزار کی زیارت کی جائے، تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا جب مزار کے احاطہ میں پہنچا تو اندر جانے سے پہلے اس کے متولیوں نے کہا کہ ننگے سر جانے کی اجازت نہیں ٹوپی اوڑھ کر جائیں۔ بدقسمتی سے صوفیاء کے ان مزاروں کے متولی بڑے بدتمیز اور سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے اس قدر درشت لہجہ میں کہا کہ میں نے مناسب یہی سمجھا کہ واپس چلا آؤں۔

مشرق میں سر کو ڈھانپنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اگر کسی سے ملنے جانا ہو، عبادت گاہ میں جانا ہو تو سر پر یا تو پگڑی باندھی جاتی تھی، یا ٹوپی اوڑھی جاتی تھی۔ چونکہ انسانی جسم میں سر کی اہمیت ہے۔ اس لئے پگڑی اور ٹوپی عزت و وقار کی علامت ہیں۔ سر کو ڈھانپنے سے آپ خلوص، بندگی اور لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لئے اگر جھگڑے میں کوئی اپنی پگڑی اتار کر حریف یا مخالف کے قدموں میں ڈال دے تو اس کی انتہائی عاجزی اور انکساری کی علامت ہوا کرتی تھی۔ پگڑی کی عزت کا اظہار اس سے بھی ہوتا تھا کہ لوگ محبت اور خلوص کے اظہار کے طور پر پگڑی بدل بھائی بن جاتے تھے۔ ہمارے ہاں اب تک نماز سر ڈھانپ کر پڑھی جاتی ہے۔عورتیں بھی اذان کی آواز سن کر فوراً سر ڈھانپ لیتی ہیں۔ سکھوں میں بھی گردوارے یا گولڈن ٹیمپل میں جانا ہو تو سر کو ڈھانپتے ہیں۔

لیکن یورپ میں اس کے برعکس بطور عزت ٹوپی یا ہیٹ اتار کر اور سر جھکا کر ادب آداب کرتے ہیں۔

بہر حال مزاروں پر ان کے متولین لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ٹوپی اوڑھ کر اور ننگے پیر

احاطے میں داخل ہوں۔

میں بینچ پر بیٹھا، خاموشی اور سکون کے عالم میں ان تاریخی یادگاروں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک سامنے سے عبدالمعبود نمودار ہوئے اور معذرت کرنے لگے کہ انہیں دیر ہوگئی تھی۔ میں نے ان کی معذرت قبول کر لی، اور فیصلہ یہ ہوا کہ اب دہلی کی دوسری تاریخی عمارتوں کو دیکھا جائے۔

ہندوستان میں تاریخی عمارتوں اور یادگاروں کو میں نے مختلف دوروں میں دیکھا۔ مگر میں اس جگہ ان جگہوں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ دہلی میں لال قلعہ دیکھنے گئے، اس کی فصلیں اب تک مضبوط اور شاندار ہیں، مگر اندر کی عمارتیں خستگی کا شکار ہیں۔ اگرچہ سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں، مگر قلعہ کو اس کی اصلی حالت میں لانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ 1857 کے بعد اول تو انگریزوں نے یہاں اپنی عمارتیں بنا کر اور اس کے کچھ حصوں پر قبضہ کر کے اس کو تباہ کیا۔ آزادی کے بعد اس کی اہمیت یہ ہے کہ ہر سال یوم آزادی پر ہندوستان کا وزیر اعظم یہاں سے خطاب کرتا ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس نسبت سے یہ تاریخ کے اس تسلسل کو باقی رکھتے ہیں کہ جو انگریزی حکومت نے توڑ دیا تھا۔

جب کوئی تاریخی عمارت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے تو اس کی خوبصورتی اور دلکشی باقی نہیں رہتی ہے۔ قلعہ کو دیکھنے سے منشی فیض حسین کی کتاب ''بزم آخر'' یاد آ رہی تھی کہ جو انہوں نے بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ہونے والی ثقافتی سرگرمیوں پر لکھی ہے۔ مرہٹوں اور انگریزوں کے تسلط کے بعد مغل بادشاہ کی علامتی حیثیت باقی رہ گئی تھی۔ قلعہ ایک کلچرل مرکز کے طور پر ابھرا تھا، دہلی اور ہندوستان کے شہریوں کو اس سے عقیدت تھی۔ سیاسی حاکمیت کھونے کے بعد مغل بادشاہ کلچرل سرگرمیوں میں وقت گزارتے تھے۔ قلعہ کی آخری شان و شوکت کے بارے میں ظہیر دہلوی نے ''داستانِ غدر'' میں تفصیلات دی ہیں۔ آنے والے باغیوں کے ہاتھوں بادشاہ کس قدر مجبور اور بے بس ہو گیا تھا۔ 1857 کے بعد انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کر کے اس کی اہمیت کو ختم کر دیا۔ قلعہ ختم ہوا، مغل دور رخصت ہوا اور یہ سب اس قلعہ کی تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔

شاہ جہاں کا آباد کیا ہوا ''شاہ جہاں آباد'' ایک ماڈل شہر تھا۔ یہ سیاسی قوت کی علامت تھا، اس میں مسجد تھی جو مذہبی عقیدت کو ظاہر کرتی تھی۔ چاندنی چوک تھا کہ جہاں عوام کے لئے تجارتی

سرگرمیاں تھیں۔ سرسیّد نے آثار الصنادید میں چاندنی چوک کا کیا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ شام ہوتی ہے اور لوگ سیر و تفریح کے لئے آ جاتے ہیں، جب شہر دار السلطنت ہوا تو امراء نے اپنی حویلیاں بنوائیں، شہر میں جا بجا مسجدیں اور مکتب قائم ہو گئے۔ 1857 نے اس شہر کو اجاڑ دیا۔ انگریزوں نے اپنے سیاسی تسلط کے لئے نئی دہلی کے نام سے ایک اور ہی شہر آباد کیا۔

جامع مسجد کے اردگرد کی گلیوں میں گھوم کر کوشش کی کہ یہ پرانی دلّی کی جھلکیاں نظر آ جائیں۔ مرزا غالب کا گھر گلی قاسم جان میں دیکھا۔ جب میں نے اس گھر کو دیکھا تو اس کے ایک حصہ میں گیسٹ ہاؤس تعمیر ہو چکا تھا، دوسرے حصہ میں لکڑیوں کی ٹال تھی اور شاید مرزا غالب کے زمانہ کی ایک بکری دروازے پر بندھی ہوئی تھی۔ ابؔ اس گھر کو بطور یادگار بنا دیا گیا ہے۔ اردگرد کے علاقوں میں آبادی کی کثرت ہے، پیدل چلنا مشکل ہے، سائیکل رکشہ میں بیٹھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔

ہمایوں کا مقبرہ فن تعمیر کے لحاظ سے انتہائی اہم ہے۔ یہاں ہمایوں کے علاوہ دوسرے مغل بادشاہوں اور شاہی خاندان کے افراد کی قبریں ہیں جب 1857 میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو بہادر شاہ ظفر نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی تھی اور یہیں سے انہیں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس مقبرہ نے مغل خاندان کی عظمت اور زوال دونوں دیکھے۔

یہاں سے نکل کر بستی نظام الدین جانا ہوا، نظام الدین اولیاء کے مزار پر رونق رہتی ہے۔ حال یہاں بھی یہی ہے کہ متولی حضرات رجسٹر لئے ہوتے ہیں، نام و پتہ لکھواتے ہیں، اور چندہ کی درخواست نہیں کرتے بلکہ حکم دیتے ہیں، ڈانٹ کر کہتے ہیں کہ پہلے حضرت امیر خسرو کے مزار پر جاؤ اس کے بعد نظام الدین اولیاء کے۔ اسی بستی میں مرزا غالب کا مزار ہے، جسے گلزار نے تعمیر کرا کے اچھی حالت میں کر دیا ہے، ورنہ سنا ہے یہ خستگی و عبرت کا نمونہ تھا۔

بستی میں جانا خود کو پریشانی میں مبتلا کرنا ہے۔ یہاں فقیروں کی اس قدر تعداد ہے کہ ان سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ اس بستی میں وہ مسجد ہے کہ جہاں سے مولانا الیاس نے تبلیغی جماعت کی ابتداء کی تھی، اس لئے یہاں تبلیغی نظر آئے کہ جن کے بستروں سے لوٹا بندھا ہوا تھا۔ افسوس کہ گندگی اور غلاظت اس بستی کی علامت ہے۔

سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ ہے۔ جب یہ پہلی بار تعمیر ہوا تو جہانگیر کو پسند نہیں آیا اور دوبارہ

سے اس کی تعمیر کرائی۔ چونکہ یہ ذرا ہٹ کر واقع ہے اس لئے یہاں سیاح کم آتے ہیں۔ وسیع و عریض علاقہ میں یہ مقبرہ واقع ہے۔ یورپ سے آنے والوں نے ان مقبروں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ کچھ نے تو ان میں رہائش اختیار کر لی کچھ نے یہاں ادارے قائم کر لئے۔ اکبر کے مقبرہ کو ایک جرمن پادری جس کا نام بفانڈر تھا، اس نے یہاں یتیم خانہ کھولا اور پرنٹنگ پریس لگایا کہ جہاں تبلیغی مواد چھاپا جاتا تھا۔

یہاں سے چل کر شہر آگرہ میں داخل ہوئے، تاج محل کو دیکھنے کی خواہش کسے نہیں ہوتی ہے۔ جب اس عمارت میں پہنچے ایک عجیب احساس تھا۔ کافی راستہ طے کر کے تاج محل کے قریب گئے، جیسے ہی داخلہ کے بعد یہ سامنے آیا ایسا محسوس ہوا کہ یہ خلاء میں واقع ہے، اگرچہ سیاحوں کی بڑی تعداد موجود تھی، مگر اس عمارت کے وجود نے ایک عجب احساس کو پیدا کیا، کہ تھوڑی دیر کے لئے حیران و ششدر ہو کر رہ گیا۔

تاج محل نہ صرف لوگوں کے لئے ایک عجوبہ ہے بلکہ غیر ملکیوں کے لئے بھی فن تعمیر کا ایک ایسا مظہر ہے کہ جو اس عہد کی تخلیقی صلاحیتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی تعمیر میں نہ صرف فن تعمیر کے ماہر معمار بلکہ ہندوستان کے کاریگر، ہنرمند اور دست کار شامل تھے کہ جن کی مجموعی صلاحیتوں نے اس فن پارے کو تخلیق کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تاج محل کی تعمیر پر ہر کوئی اپنا دعویٰ کرتا ہے۔ اہل یورپ کا خیال تھا کہ ایسی خوبصورت عمارت کوئی ہندوستانی تعمیر نہیں کر سکتے ہیں، لہٰذا کہا گیا کہ اس کا نقشہ کسی اطالوی معمار نے بنایا تھا۔ آزادی کے بعد ہندو انتہا پسندوں نے اپنا نظریہ دیا کہ درحقیقت یہ مندر تھا کہ جسے مقبرہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اگرچہ تاج محل کی تعمیر، اس کے اخراجات کی تفصیلات معاصر تاریخوں میں موجود ہیں، بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے معمار کا نام نہیں ہے، اگرچہ کچھ مورخوں نے استاد احمد کے نام کو تلاش کیا ہے، مگر اس کا واضح ثبوت نہیں ہے۔ یہ نتیجہ ہے اس تاریخ نویسی کا کہ جس میں شاہی خاندان اور امراء کے علاوہ کاریگر اور ہنرمند غائب ہو جاتے ہیں۔

آخری عہد مغلیہ میں سلطنت زوال کا شکار تھی۔ اس عرصہ میں تاج محل کی عمارت بھی زوال کا شکار ہوئی۔ یہاں جھاڑیوں اور بے ہنگم درختوں نے اس کی خوبصورتی کو ماند کر دیا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت آئی، تو انگریز سیاح جب اس کو دیکھنے آتے تو اپنے ساتھ ہتھوڑے اور

چھینیاں لے کر آتے اور مزار اور دیواروں سے قیمتی پتھر کھرچ کر نکال لے جاتے تھے۔ اس نے مزید عمارت کو نقصان پہنچایا۔ ولیم بینٹک جب گورنر جنرل تھا اس وقت یہ تجویز ہوئی کہ مغل عمارتوں سے سنگ مرمر لے کر اسے لندن کی مارکیٹ میں فروخت کیا جائے۔ اس کی ابتداء دہلی کی کچھ عمارتوں سے ہوئی، پھر یہ فیصلہ ہوا کہ تاج محل کو مسمار کر کے اس کا سنگ مرمر فروخت کیا جائے، اس مقصد کے لئے مشینیں تاج محل پہنچ گئی تھیں اور اسے مسمار کرنے کا کام شروع ہونے والا تھا کہ لندن سے یہ خبر آئی کہ بڑی تعداد میں سنگ مرمر اٹلی کی عمارتوں سے آ گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی قیمت گر گئی ہے۔ اس خبر نے تاج محل کو بچا لیا۔ جب لارڈ کرزن ہندوستان کا گورنر جنرل ہو کر آیا تو اس نے تاج محل کی طرف توجہ دی، اور اس کو موجودہ صورت میں بحال کیا۔

اس کے بعد آگرہ کا قلعہ آتا ہے۔ میں نے اس کو تین چار بار دیکھا ہے۔ اب تک جتنے قلعے دیکھے ان میں سب سے عمدہ اور اچھی حالت میں یہی قلعہ ہے۔ اکبر نے اپنے آخری دن یہیں گزارے تھے اور یہیں اس کی وفات ہوئی تھی۔ شان و شوکت میں جہاں گیر کا محل فن تعمیر کے لحاظ سے خوب عمارت ہے، اس کے بعد قلعہ کا وہ حصہ آتا ہے کہ جہاں شاہ جہاں نے زندگی کے آخری دن گزارے تھے یہ بڑی خوبصورت عمارت ہے، سامنے سے کھلی ہوئی ہے، اور دریائے جمنا کا نظارہ۔ یہاں سے تاج محل کی جھلک نظر آتی ہے۔ یقیناً شاہ جہاں اس کو دیکھ کر ممتاز محل کی قربت کو محسوس کرتا ہو گا۔ اسی سے ملحق وہ حصہ ہے کہ جہاں جہاں آراء بیگم کی رہائش تھی۔ پورا قلعہ اس حالت میں ہے کہ اس میں جا کر رہا جا سکتا ہے۔

وہاں سے چل کر فتح پور سیکری میں آنا ہوا۔ اس جگہ اکبر نے سلیم چشتی کی قربت میں اپنا نیا دارالسلطنت تعمیر کرایا تھا۔ اکبر کے ان محلات اور عمارتوں کو دیکھ کر اس کی شخصیت اور اس کے وژن کا اظہار ہوتا ہے۔ اکبر نے یہاں بڑی پُرسکون زندگی گزاری مثلاً ایک ایرانی سیاح نے لکھا ہے کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ اکبر تہمد باندھے ہوئے، فتح پور سیکری کے محل کی چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا۔

یہاں پر کئی اہم تاریخی واقعات ہوئے، مثلاً ایک دن جب اکبر محل کے اوپر کے حصہ میں، دوپہر کے وقت آرام کر رہا تھا کہ شور و غل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ ماہم انگا کے لڑکے ادھم خاں نے اکبر کے رضاعی باپ قطب الدین کا قتل کر دیا ہے اور وہ

خوں آلود ننگی تلوار لئے اوپر آ رہا ہے۔ جب ادھم خاں اکبر کے سامنے آیا، تو اکبر نہتا تھا، اس نے غصہ میں ادھم خاں کو ہندی زبان میں گالی دی اور بڑھ کر اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اس کے بعد حکم دیا کہ اسے چھت سے نیچے پھینک دیا جائے، اسے گرا دیا گیا مگر وہ زندہ رہا، لہٰذا اسے دوسری بار گرایا گیا جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی۔ اکبر نے یہ خبر خود ماہم انگا کو جا کر سنائی۔

ادھم خاں اس سے پہلے بھی شاہی احکامات کی خلاف ورزی کر چکا تھا۔ گجرات کی فتح کے موقع پر اس نے گجرات کے حکمراں کی خوبصورت کنیزوں پر تصرف کیا اور مال غنیمت میں بھی بد دیانتی کی۔ جب اکبر تیز مارچ کرتا ہوا، اچانک گجرات پہنچا، تو ماہم انگا نے اس خیال سے کہ کنیزیں حقیقت بیان نہ کر دیں انہیں قتل کرا دیا۔ اکبر کو اگرچہ سب معلوم ہو گیا تھا، مگر اس نے درگزر کیا مگر اس کے رضاعی باپ کا قتل، اس کے لئے نا قابل برداشت تھا، لہٰذا اس نے اس کی سخت سزا دی۔

فتح پور سیکری میں رہتے ہوئے اکبر کے دورِ حکومت کے چند اہم واقعات ہوئے۔ عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ ایک رات جب کہ چاند اپنے شباب پر تھا، اور خوبصورت چاندنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی، اکبر نے علماء اور امراء کی میٹنگ بلوائی، اکبر کے لئے دن رات سب ہی اہمیت کے تھے، وہ کسی بھی وقت امراء کو اکٹھا کر کے ان سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ اس رات اس نے علماء کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا کہ اس نے چار سے زیادہ شادیاں کر لی ہیں، اب انہیں کیسے مذہبی طور پر جائز قرار دیا جائے۔ اس پر علماء نے تاویلیں پیش کرنا شروع کر دیں۔ ایک نے کہا کہ قرآن شریف میں آیا ہے دو، دو، تین، تین، چار چار شادیاں جائز ہیں، اس کا مطلب ہے کہ دو، دو سے چار، تین، تین سے چھ اور چار چار سے آٹھ ہوئیں۔ اس طرح کل تعداد 18 ہوئی۔ ایک دوسرے نے کہا، دو، دو، تین، تین، چار چار سے 9 شادیاں جائز ہوئیں۔ عبدالقادر بدایونی نے ان سے الگ ہٹ کر مشورہ دیا کہ مالکی فقہ میں متعہ جائز ہے اس لئے اگر مالکی فقہ کا قاضی فتویٰ دیدے تو یہ شادیاں جائز ہو جائیں گی۔

اکبر کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اس نے اسی وقت ایک مالکی فقہ کے قاضی کا تعین کیا۔ اس نے فتویٰ دے کر اس کی شادیاں جائز قرار دیں۔ مگر اکبر نے فوراً ہی اسے قضاۃ کے عہدے سے برخواست کر دیا تاکہ دوسرے لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ جب فادر مونسراٹ کا عیسائی مشن

ہندوستان آیا تو وہ اکبر کے قلعے فتح پور سیکری آئے۔ مونسراٹ لکھتا ہے کہ اکبر رات کو کسی وقت انہیں محل میں بلا لیتا تھا اور ان سے مذہب پر بحث کرتا تھا۔ غریب عیسائی مشنری رات کو ڈرتے رہتے تھے کہ نہ جانے کب ان کا بلاوا آجائے۔

شاہی محل سے قریب ہی اکبر نے عبادت خانہ کی عمارت تعمیر کرائی تھی، یہ اس کے ذہن کی عجیب وغریب اختراع تھی، اس کے دل میں ہر مذہب کے لئے عزت واحترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ بین المذاہب کی یہ بحثیں اس نے شروع کیں اور لوگوں میں مذاہب کے بارے میں رواداری کے جذبات پیدا کئے۔ عبادت خانہ کی ہر عمارت اب ایک ملبہ کا ڈھیر ہے۔ مگر اس کی اہمیت کو تاریخ میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔

اکبر کا یہ دستور تھا کہ اکثر دربار سے اٹھ کر سیدھا شاہی کارخانے میں چلا جاتا تھا اور وہاں کاریگروں کے ساتھ بیٹھ کر کام کرتا تھا۔ اس کی زندگی فتح پور سیکری میں پُر امن اور سکون کی تھی۔ مگر جب اسے اطلاع ملی کہ اس کے بھائی نے کابل میں بغاوت کر دی ہے تو فتح پور کو چھوڑ کر ایسا گیا کہ پھر واپس اس شہر میں نہیں آیا۔ اس کا یہ شہر اب تک خالی اور اداسی کے عالم میں کھڑا، اپنے مکینوں کا انتظار کر رہا ہے۔

1992ء میں مجھے انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کی جانب سے دعوت نامہ ملا، وہ اکبر کی 450 ویں سالگرہ منا رہے تھے۔ ہندوستان جانے کے لئے ہمیشہ ویزا کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اس بار بھی اس کے ملنے میں مشکلات پیش آئیں، کونسل کے صدر اس وقت پروفیسر عرفان حبیب تھے۔ بہرحال ویزا مل گیا۔ کانفرنس میں ہندوستان سے عرفان حبیب اور بڑے بڑے مورخ موجود تھے۔ باہر کے ملکوں سے کچھ مورخ آئے ہوئے تھے عرفان حبیب صاحب نے ایک سیشن کی صدارت بھی مجھ سے کرائی، میں نے یہاں جو مضمون پڑھا، اس کا عنوان تھا ''اکبر پاکستان کی نصاب کی کتابوں میں'' جب میں نے اس مضمون کے سلسلہ میں نصابی کتب کو دیکھا تو حیرت ہوئی کہ ان میں اکبر کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ ایک دلچسپ صورت حال اس وقت آئی کہ جب میں نے آئی۔ ایچ۔ قریشی کی مرتب کردہ کتاب ''ہسٹری آف پاکستان'' دیکھی، اس میں پروفیسر عبدالرشید کا مضمون مغل ہسٹری پر تھا۔ اس میں جب اکبر کا ذکر آیا تو میں پڑھ کر پریشان ہو گیا کہ اس کا ایک حصہ اکبر کے خلاف تھا اور اس میں وہی دلیل اور الفاظ استعمال کئے گئے تھے جو

آئی۔ایچ۔قریشی کی کتاب ''مسلم کیمونٹی آف انڈین سب کون ٹی نینٹ'' میں ہیں۔اب قریشی اور عبدالرشید دونوں پائے کے اسکالرز تھے۔میں نے سوچا کہ کس نے کس کو نقل کیا ہے چیک کرنے پر معلوم ہوا کہ قریشی صاحب کی کتاب پہلے چھپ چکی تھی، اب حیرت تھی کہ پروفیسر عبدالرشید جیسے مورّخ نے بلاحوالہ کے اس حصہ کو کیسے نقل کر دیا۔

جب میں نے مضمون میں اس کا ذکر کیا تو عرفان حبیب صاحب نے بتایا کہ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد پروفیسر عبدالرشید علی گڑھ آئے، تو انہوں نے سوال کیا کہ اب تک آپ ہمیں کچھ اور پڑھاتے رہے، اب آپ کیا لکھ رہے ہیں۔اس پر انہوں نے وضاحت کی کہ یہ حصہ قریشی صاحب نے ان سے پوچھے بغیر، ان کے مضمون میں ڈال دیا، اور انہوں نے بھی اسے چھپنے کے بعد دیکھا، اور اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ پھر انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کے مصرا صاحب نے مجھے بتایا کہ آپ کے ویزا کے سلسلہ میں انڈیا کی ایجنسیز نے آپ کی مخالفت کی تھی اور بمشکل سے انہوں نے کلیرنس دی۔میرے لئے خوشی کی بات تھی کہ میں اپنے ملک میں اور ہندوستان دونوں کی انٹیلی جنس ایجنسیوں میں غیر مقبول ہوں۔

میرے اس مضمون کا ہندوستان کے اخباروں میں بڑا چرچا ہوا۔میرا مقصد تو تعصب کو دکھانا تھا کہ جو پاکستان میں اکبر کے خلاف ہے،اس سے زیادہ نہیں۔

کانفرنس میں پروفیسر احسن رضا خاں سے ملاقات ہوئی، یہ شملہ میں ہماچل یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔اب ریٹائر ہو کر شملہ میں رہتے ہیں۔خوش مذاق، اور دوست انسان ہیں، ان کا ساتھ ہوا تو انہوں نے کافی لوگوں سے ملوایا۔ایک دن شام کو مجھے لے کر جے۔این۔یو گئے، وہاں پہلے تو پروفیسر دلباغ سنگھ سے ملے۔اس کے بعد پروفیسر ہربنس کھیا سے ملوایا، اس ملاقات کے بعد سے ہربنس بھائی سے ایسی دوستی ہوئی کہ جواب تک چل رہی ہے، بڑے عالم و فاضل ہیں، خاص طور سے مغل تاریخ پر۔

1993ء کی بات ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے کچھ دانشوروں اور سیاسی کارکنوں نے ''پیوپلز ٹو پیوپلز'' ڈائیلاگ کے نام سے ایک آرگنائزیشن بنائی، اس کی جانب سے پہلی مرتبہ پاکستان سے 100 افراد شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔نوائے وقت نے طنزیہ خبر لگائی کہ ایک سو محبّ وطن پاکستانی ہندوستان جا رہے ہیں۔

یہ بڑا اچھا اور خوشگوار تجربہ تھا، ہندوستان سے بھی اتنے ہی لوگ شریک ہوئے، بڑی جذباتی تقریریں ہوئیں، نظمیں پڑھی گئیں، اور آپس میں میل جول، اور امن کی باتیں ہوئیں، ہندوستان کے میڈیا نے بھی خوب خبریں لگائیں۔ ٹی وی چینلز نے انٹرویو لئے، خاطر تواضع ہوئی، اور ایسا محسوس ہوا کہ دونوں ملکوں کے لوگ آپس میں مل گئے ہیں، اور آنے والے وقتوں میں یہ میل جول اور بڑھے گا۔

کانفرنس کے دوران ایک دن عبدالمعبود آئے اور کہنے لگے کہ نرملا دیش پانڈے جو ایک سماجی کارکن ہیں وہ کچھ پاکستانی مندوبین سے ناشتہ پر ملنا چاہتی ہیں، آپ ذرا ان لوگوں کو لے کر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر آ جائیں۔

نرملا دیدی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ ہندوستان پاکستان دوستی کی زبردست حامی تھیں۔ مگر نہ جانے کیوں اُنہیں اس کانفرنس میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ ناشتے میں کوئی دس بارہ لوگ شریک تھے۔ ان سب ہی کا یہ خیال تھا کہ اگر لوگوں کی جانب سے اپنی اپنی حکومتوں پر دباؤ ڈالا جائے تو حکومتیں مجبور ہوں گی کہ تعلقات بنائیں۔

شاید 1995ء کی بات ہے کہ ہربنس مکھیا لاہور آئے۔ ان کا آبائی شہر گجرات ہے، مگر اب اس شہر کی یادیں ہیں، وہاں کوئی جاننے والا تو رہا نہیں، ویسے بھی وہ وہاں نہیں جاسکتے تھے کیونکہ ان کے پاس صرف لاہور کا ویزا تھا، اور اس میں بھی پولیس رپورٹنگ شامل تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری دونوں حکومتیں ایک دوسرے کے شہریوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔ ذرا بھی خیال نہیں کہ ایک عالم وفاضل شخص کو مجرموں کی طرح پولیس اسٹیشن میں جا کر اپنے آنے اور جانے کی رپورٹ کرانی ہوتی ہے۔

ہربنس بھائی کو مغل تاریخ کے اسکالر ہونے کی حیثیت سے لاہور شہر اور یہاں مغل عمارتوں اور یادگاروں کو دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ مشکل سے چار دن رہے مگر ان کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔

میری بڑی بیٹی عطیہ کو ابتداء میں آرٹ کا شوق تھا، اس لئے اس نے نیشنل کالج آف آرٹ میں داخلہ لے لیا۔ ابھی وہ پہلے سال ہی میں تھی کہ ایک دن کالج کی بس سے اترتے ہوئے اس کا پیر سلپ ہوا، اور اس کے ٹخنے میں دراڑ پڑ گئی جس کی وجہ سے وہ پلاسٹر میں بندھے پیر کے ساتھ تقریباً ایک یا ڈیڑھ مہینے گھر پر رہی۔ صحت یاب ہونے کے بعد اس نے کالج دوبارہ سے جوائن کیا،

مگراس کے ٹیچر نے کہا کہ وہ اس سال امتحان نہ دے۔اس نے ضد کی کہ وہ پوری طرح سے تیار ہے اور امتحان ضرور دے گی۔اس پر انہوں نے کہا کہ اس صورت میں وہ اسے فعل کر دیں گے اور ہوا بھی یہی، نہ صرف یہ بلکہ اسے کالج سے نکال دیا گیا۔ اس پر ہربنس مکھیا نے کہا کہ وہ جے۔این۔یو آ جائے، شعبہ تاریخ میں اسے داخلہ مل جائے گا۔ اس وقت جے۔این۔یو کے تاریخ کے شعبہ میں رومیلا تھاپر، بپن چندر، ستیش چندر اور خود ہربنس مکھیا پڑھا رہے تھے۔لہٰذا اس نے داخلہ کی درخواست دی اور اسے داخلہ مل گیا۔

1996ء، جس سال عطیہ کو جے۔این۔یو جوائن کرنا تھا، اسی سال پروفیسر امریت سنگھ نے تقسیم ہند کے 50 سال ہوئے پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا۔ مجھے بھی دعوت دی گئی۔اس میں شرکت کے لئے ہندوستان کے مشہور مورخ شامل تھے، انگلستان سے بھی کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ میں جے۔این۔یو میں پروفیسر امتیاز احمد کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔اسی دوران عطیہ کو چھوڑنے کے لئے میری بیگم ذکیہ اور شہلا و نین تارا بھی دہلی آ گئے، پھر سب امتیاز بھائی کے مہمان ہو گئے۔انہوں نے ایک لحاظ سے پورا گھر ہمارے حوالے کر دیا اور خود ڈرائنگ روم میں شفٹ ہو گئے۔عطیہ کو گنگا ہاسٹل میں کمرہ مل گیا۔اس کو وہاں شفٹ کرا کے، ہم نے واپسی کا ارادہ کیا۔

ہندوستان اور پاکستان میں کوئی چیز یقینی نہیں ہوتی ہے۔ جب ہم ایئر پورٹ پر پہنچے، بورڈنگ کارڈ لے کر امیگریشن پر آئے تو پتہ چلا کہ ہم سب کو تو پولیس رپورٹنگ کی ضرورت نہیں تھی، مگر نہ جانے کیوں ذکیہ کی پولیس رپورٹنگ ہوئی تھی، ہم نے ان کے ویزا میں نہیں دیکھا۔اب ہندوستانی بیوروکریسی آتی ہے، کہا گیا کہ وہ نہیں جاسکتیں جب تک پولیس رپورٹنگ نہ ہو، ہم نے کہا بھی کہ شاید یہ غلطی سے لکھ دیا گیا ہے اور جب کہ ہم واپس جا رہے ہیں تو جانے دو۔ساری دلیلیں بیکار ہوئیں۔ ذکیہ کو رکنا پڑا۔ یہاں پر کام آئیں نرملا دیش پانڈے، جنہوں نے پولیس رپورٹنگ کرائی اور پھر دو یا تین دن بعد ان کا آنا ہوا۔

بہرحال اس صورت حال سے دونوں ملک کے مسافر دوچار ہوتے ہیں، اس کے بعد سے ہندوستان جانے کا سلسلہ رہا، کانفرنسوں، سیمیناروں، یا دوستوں سے ملنے کے لئے۔

دہلی کے علاوہ دو مرتبہ بمبئی جانا ہوا، ایک مرتبہ ایک کانفرنس کمیونل ازم کمبیٹ کی ایڈیٹر تیستا سیتل ورڈ نے نصابی کتابوں پر کرایا تھا۔اس سیمینار میں رومیلا تھاپر اور کے۔این۔پانیکر بھی

تھے۔ایک دوسری کانفرنس شہر کی تاریخ پر تھی۔ان کانفرنسوں کی وجہ سے ہندوستان کے دانشوروں سے دوستی ہوگئی،اوران سے بحث ومباحثہ میں مزہ آنے لگا۔

1999ء میں مجھے ایک اطلاع ملی کہ نہرو میوزیم اینڈ لائبریری نے مجھے سینئر فیلوشپ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔لیکن ایک پاکستانی ہونے کی وجہ سے میرے ویزے اور رہنے کے لئے حکومت ہندوستان سے اجازت لینی تھی۔اس وقت بی۔جے۔پی کی حکومت تھی۔میری فائل کلچرل منسٹر کے پاس ایسی گئی کہ پھر واپس نہیں آئی اور یوں میں ایک بار پھر دونوں ملکوں کے تعصب کا شکار ہوگیا۔

2002ء کی بات ہے کہ ہندوستان کی رام کرشن آرگنائزیشن کی جانب سے مجھے ''کمیونل ہارمنی'' (Communal Harmony) ایوارڈ دیا گیا۔اس کی ایک پُرشکوہ تقریب دہلی میں ہوئی،ایوارڈ دینے کے لئے دلائی لامہ کو بلایا گیا تھا۔میرے علاوہ ہندوستان سے دولوگ تھے جنہیں یہ ایوارڈ دیا گیا تھا۔تقریب میں دلائی لامہ سے مختصر ملاقات رہی۔انہیں جلدی اس لئے جانا تھا کہ ان کے سونے کے اوقات مختلف تھے وہ شام کو چھ بجے سوجاتے ہیں اور رات میں تین بجے اٹھ کر عبادت کرتے ہیں۔مجھے اب تک جو ایوارڈز ملے،ان میں یہ تیسرا تھا۔پہلا فیض فاؤنڈیشن کی جانب سے 1986 میں فیض ایوارڈ دیا گیا تھا۔دوسرا ایوارڈ 2000ء میں سندھی ادبی سنگت کی جانب سے پیر حسام الدین تاریخ دیا گیا۔اس کے بعد میں کچھ دن دہلی میں ٹھہرا اور دوستوں سے ملاقات ہوئی، بلکہ ہمارے دوست ادریس مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر علی گڑھ لے گئے،جہاں عرفان حبیب صاحب سے ملاقات کی اور ساتھ میں علی گڑھ یونیورسٹی کی عمارتیں دیکھیں۔

اس کے بعد سے ہندوستان برابر آنا جانا ہوتا رہا۔ایک اور اہم دورہ اس وقت ہوا کہ جب ہندوستان کی حکومت کی جانب سے پاکستان کے مورخوں کو دعوت ملی۔اس دعوت کے پس منظر میں پاکستان میں ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر ٹی۔سی۔ راگھوون تھے وہ خود بھی تاریخ داں ہیں اور عبدالرحیم خان خاناں کے ہندی دوھوں پر کام کررہے ہیں۔ان کی تحقیق کے سلسلہ میں ان سے ملاقاتیں رہیں جو دوستی میں بدل گئیں۔انہوں نے اس دورے کا انتظام کیا اور مجھے اس کا سربراہ بنا دیا۔اب مسئلہ یہ تھا کہ آٹھ مورخ کہاں سے اکٹھا کریں۔بہر حال یہ مشکل کام ہوا،ان میں ڈاکٹر

جعفر احمد، ڈاکٹر طارق رحمان، ڈاکٹر تنویر احمد، احمد سلیم، مسز فوزیہ سعید، اور بلوچستان یونیورسٹی کے مسٹر کندی شامل تھے۔ سب سے پہلے ہم لوگ شانتی نکیتن گئے کہ جہاں ہسٹاریکل کانگرس اجلاس ہو رہا تھا۔ اس میں تقریباً ایک ہزار پانچ سو مورخ موجود تھے۔ عرفان حبیب صاحب کی نگرانی میں اس کانفرنس کی کارروائی ہو رہی تھی۔ کانفرنس میں بیک وقت 5 یا 6 سیشن ہو رہے تھے۔ یہ کہیے کہ ایک میلہ تھا کتابوں کے اسٹال تھے، کھانے کا بہترین انتظام تھا، ہر مندوب کو ٹکٹ دیدیئے گئے تھے ایک بڑے شامیانے میں کھانے کے اسٹال تھے۔ کوئی دھکم پیل نہیں تھی، سب لوگ آرام سے اپنے پسندیدہ اسٹال سے کھانا لے کر کھا رہے تھے۔

ہمیں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی جانب سے چائے کی دعوت تھی۔ ٹیگور کے زمانے کی یونیورسٹی دیکھی جب کہ درختوں کے سایہ میں کھلی فضا میں پڑھائی ہوتی تھی۔ کانفرنس میں کئی مورخوں سے ملاقات رہی۔

اس دورہ کے بعد ایک دن علی گڑھ گئے جہاں عرفان حبیب کے ساتھ شعبہء تاریخ کے اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ عرفان حبیب صاحب Peoples History of India کے منصوبہ پر کام کر رہے ہیں۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی دیکھنے گئے اس کی مسجد میں سرسیّد اور محسن الملک کی قبریں ہیں۔ یونیورسٹی کے اندر ہی سرسیّد کا وہ بنگلہ دیکھا جہاں وہ رہتے تھے۔ جسے اب میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ایک دن وائس چانسلر نے ڈنر پر بلایا اور باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ الحمداللہ، علی گڑھ کے طالب علم نماز روزے کے بڑے پابند ہیں کیونکہ دوستوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اس لئے گھوم پھر کر اس کے ہوسٹل اور شعبہ جات کی عمارتیں دیکھیں۔ یونیورسٹی بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے، اور اب بڑی سرسبز ہے۔ بقول عرفان حبیب صاحب کے یونیورسٹی میں درخت لگانے کا کام ذاکر حسین صاحب کے زمانے میں ہوا جب وہ وائس چانسلر تھے۔ یونیورسٹی کی آزاد لائبریری نادر مخطوطات کی وجہ سے مشہور ہے۔

شانتی نکیتن سے واپسی پر ایک دن کلکتہ میں ٹھہرے، یہاں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے دفتر گئے، فورٹ ولیم کالج اور کلکتہ یونیورسٹی میں کچھ وقت گزارا۔ شہر کو پوری طرح نہیں دیکھ پائے۔ ٹریفک بہت ہے اس لئے کہیں آنا جانا مشکل تھا۔

اس کے بعد ہم دہلی آئے، دہلی میں جامعہ ملیہ دیکھی، وہاں تاریخ کے اساتذہ سے ملے۔ جے۔این۔یو میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے نصابی کتابوں پر ایک سیمینار میں شرکت کی۔ انڈین ہسٹاریکل کونسل میں اسٹاف سے ملاقات کی، میں پہلے سے اکثر کو جانتا تھا اس لئے تجدید ملاقات ہوگئی۔ اس پورے دورے میں دفتر خارجہ کا ایک آفیسر ہمارے ساتھ تھا زندگی میں یہ پہلا آفیشل دورہ تھا، اگر اس قسم کے دورے ہوتے رہیں تو دونوں ملکوں کے دانشوروں میں دوستی بڑھے گی۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ اکثر دعوت نامے کسی نہ کسی آرگنائزیشن کی جانب سے آتے ہیں اور ویزا ملنے میں دونوں جانب سے مشکلات پیش آتی ہیں۔

ہندوستان میں جانے کے نتیجہ میں کئی دوستیاں ہوئیں، ان میں سے کچھ ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ زندگی کی یادگار ہیں۔ وقت کے ساتھ ان میں سے کچھ نے اس دنیا سے رخت سفر باندھا، اور ان کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہندوستان خالی ہوگیا کیونکہ ان کے دم سے ڈھارس رہتی تھی اور ہندوستان میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن زندگی اسی کا نام ہے اور وقت یوں ہی رواں دواں رہتا ہے۔ اب بھی ہندوستان میں بہت دوست ہیں اور وہاں جاکر ان کے درمیان پاکر خوشی و مسرت کا اظہار ہوتا ہے۔ چونکہ اکثر دہلی میں ہیں، اس لئے اگر جانا ہو تو دہلی میں سارا وقت گزر جاتا ہے۔ ہندوستان میں دیکھنے کو بہت کچھ ہے، اس کی حسرت رہی کہ یہ سب دیکھا جائے، مگر انسان کی خواہشات کہاں پوری ہوتی ہیں، میری یہ خواہشات بھی اسی طرح ادھوری ہیں، اور شاید رہیں گی۔

نرملا دیش پانڈے کو ان کے ساتھی اور جاننے والے دیدی کہا کرتے تھے۔ وہ سب کے لئے بڑی بہن کی طرح تھیں۔ خوش مزاج، نرم لہجہ میں گفتگو کرنا، کبھی غصہ اور ناراضگی کا اظہار نہیں کرنا، وہ ایک سماجی کارکن تھیں سماجی سرگرمیوں میں انہوں نے ونوبا بھاوے کے ساتھ کام کیا جو گاندھی جی کے ماننے والے تھے انہوں نے ہندوستان میں پھر کر زمینداروں کو اس پر آمادہ کیا کہ اپنی زمین کا ایک حصہ کسانوں کو دیدیں۔ دیدی کا کہنا تھا کہ کافی زمینداروں نے زمینیں دیں۔ میری ان سے بحث ہوئی کہ ٹھیک ہے کچھ نے زمینیں دیں، کیا اس سے مسئلہ کا حل نکل آیا۔ کیا ہندوستان کے کسان غربت و مفلسی سے آزاد ہوگئے۔ وہ بحث نہیں کرتی تھیں، مسکرا کر خاموش ہوجاتی تھیں، مگر دھن کی پکی تھیں، اپنے کام میں لگی رہتی تھیں۔ ان کے کام اور خلوص کا نتیجہ یہ تھا

کہ ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا۔ امریت سنگھ کہا کرتے تھے بھئی وہ اپنے لئے تو کچھ نہیں مانگتی ہے، دوسروں کے لئے کہتی ہے، تو کون ہے جو انکار کرے گا۔ ان کے گھر پر ہمیشہ لوگوں کا مجمع رہتا تھا۔ پورے ہندوستان سے ہر قسم کے لوگ آتے تھے اور اپنے مسائل ان کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ کسی سے انکار نہیں کرتی تھیں اور ہر ایک کی مشکل دور کرنے پر تیار رہتی تھیں۔

جب عطیہ کا داخلہ جے۔ این۔ یو میں ہو گیا تو مسئلہ اس کے ویزے کا آیا۔ ہندوستان کی حکومت کا کہنا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان طالب علموں کے لئے ویزا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حسب معمول دیدیؒ سے کہا گیا کہ اس مسئلہ کا حل تلاش کریں۔ جب وہ وزارت داخلہ کی بیوروکریسی سے کام کرانے میں ناکام ہو گئیں تو پھر وہ سیدھی ہندوستان کے وزیر اعظم گجرال کے پاس گئیں اور ان سے عطیہ کے ویزے کی بات کی۔ گجرال نے فوراً ویزے کی منظوری کے لئے خط لکھوایا اور دیدی کے حوالے کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب عطیہ وزیر اعظم گجرال کا خط لے کر وزارت دارخلہ کے آفس گئی تو خط دیکھ کر افسر صاحب نے کہا کہ ان لوگوں کو رولز اور ریگولیشنز کے بارے میں پتہ تو ہوتا نہیں ہے، صرف سفارش کر دیتے ہیں۔ بہرحال انکار ممکن نہیں تھا، اسے دو سال کا ویزا دیدیا گیا۔

دوسری بار جب عطیہ نے ایم۔فل میں داخلہ لیا تو پھر ویزے کا مسئلہ آیا۔ اس کی درخواست وزارت خارجہ و داخلہ میں ایک میز سے دوسری میز پر بغیر کسی فیصلہ کے جاتی رہی۔ اس بار ہندوستان میں بی۔ جے۔ پی کی حکومت تھی لہٰذا دیدی اڈوانی کے پاس جا پہنچی۔ اس نے کہا پاکستانی لڑکی کو ویزا چاہیئے، ضرور، اس نے بھی فوراً سفارشی خط دیدیا اور اس طرح مزید دو سال کا ویزا مل گیا۔

میں سوچتا ہوں یہ ہندوستان ہی میں ممکن تھا کہ جہاں ایک سماجی کارکن کی اتنی عزت تھی، اور یہ جمہوریت اور اس کی سوچ تھی کہ لبرل اور انتہا پسند دونوں جماعتوں کی حکومت میں ان کی بات کو سنا گیا۔

جب بھی میرا ہندوستان جانا ہوتا، دیدی کی کوشش ہوتی تھی کہ مجھے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملائیں۔ ہندوستان میں جب بھی بیرونی ملکوں کے سربراہ آتے تو دیدی ان کو گاندھی جی کی سمادھی پر لے جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ میں اتفاق سے گاندھی جی کے یوم وفات پر دہلی میں تھا۔

دیدی نے کہا کہ صبح امتیاز بھائی کے ساتھ میں سمادھی، جوراج گھاٹ پر واقع ہے آ جاؤں۔ اس دن سردی بہت تھی، صبح صبح اٹھ کر میں اور امتیاز بھائی سمادھی پر پہنچ گئے۔ یہاں کانگرس پارٹی کے اہم اراکین آئے ہوئے تھے، جب دعائیں اور تقریریں ختم ہوئیں تو انہوں نے مجھے کانگرس کے اہم ممبران سے ملایا۔ یہاں پاکستان کے ہائی کمشنر بھی موجود تھے جو مجھ سے مل کر بڑے حیران ہوئے کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔

ایک مرتبہ وہ برلا ہاؤس لے گئیں کہ جہاں گاندھی جی قیام کرتے تھے۔ اسی جگہ ان کا قتل ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس دن انہیں پراتھنا جانے میں ذرا دیر ہو گئی تھی، اس لئے وہ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے اس جگہ پہنچے تھے۔ یہاں دیدی نے میرا ایک لیکچر رکھ دیا تھا۔ لیکچر میں کانگرس کے ممبران اور گاندھی جی کے پیروکار موجود تھے۔ حاضرین نے سوال کیا کہ پاکستان میں لوگ گاندھی جی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ہمارے ہاں تو سوچ ہی اور ہے۔

ایک اور مرتبہ وہ مجھے نرسیما راؤ سے ملانے لے گئیں۔ یہاں ہندوستان میں سابق وزیر اعظم کو بڑی مراعات دی جاتی ہیں۔ ابتداء میں راؤ صاحب بڑے محتاط تھے لیکن جب بات چیت ذرا آگے بڑھی تو بے تکلف ہو گئے۔ وہ بڑی شستہ اردو بول رہے تھے۔ دیدی نے بتایا کہ وہ کئی زبانیں جانتے ہیں، اور جب ان سے بات چیت ہوتی ہے تو مراٹھی بولتے ہیں۔ مجھ سے فرمائش کی کہ اگلی مرتبہ آؤں تو اپنی کتابیں انہیں دوں۔ افسوس کہ ان سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔

ہندوستان اور پاکستان میں دوستی کے لئے وہ تمام زندگی سرگرم رہیں۔ انہوں نے دونوں جانب سے سابق فوجیوں کو امن کی تحریک میں شامل کیا۔ وہ جنرل مشرف سے بھی ملتی تھیں اور دوستی کی بات کرتی تھیں۔ وہ پاکستان کے لبرل اور سیکولر طبقوں میں بڑی مقبول ہو گئیں تھیں۔ جب بھی انہیں موقع ملتا تھا، پاکستان آتی تھیں اور امن کی بات کرتی تھیں۔

جب ایک دن عبدالمعبود نے فون پر اطلاع دی کہ دیدی کا انتقال ہو گیا ہے تو سن کر ایک دھچکہ لگا۔ عبدالمعبود نے بتایا کہ ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے تھیں۔ رات کو سوتے میں وفات پا گئیں۔ امن کی خواہش مند کی موت بھی بڑی پُر امن ہوئی۔

ایسا محسوس ہوا کہ اب ہندوستان میں جائیں اور دیدی کو نہ پائیں تو کتنا صدمہ ہوگا۔ ان کی زندگی میں اطمینان تھا کہ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو دیدی مدد کو آ جائیں گی۔ ویزا دلوا دیں گی،

اس کی مدت میں توسیع کرا دیں گی، لوگوں سے ملوائیں گی۔ آپ جتنے لوگوں سے ملتے ہیں، اتنا ہی آپ کا ہندوستان کے ساتھ تعلق بڑھتا ہے۔ ان کی موت نے پاکستان کو ایک زبردست خیرخواہ سے محروم کردیا۔

پروفیسر امریت سنگھ سے پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی، وہ پروفیسر رشید صاحب کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے، یہ گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق پرنسپل رہ چکے تھے اور امریت سنگھ کے کلاس فیلو تھے۔ بڑی شفقت، اور محبت سے ملے، میری کچھ تحریریں پڑھ چکے تھے، اس لئے ملاقات کی خواہش کی تھی۔ کہنے لگے کہ وہ ہندی کے مقابلہ میں اردو زیادہ سہولت سے پڑھ سکتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے پنجاب میں اردو کا رواج تھا، اور سب ہی ہندو، سکھ، یا مسلمان اردو پڑھتے تھے۔ مجھے لندن میں لاہوراسنگھ ملے تھے جو درزی کا کام کرتے تھے اور اپنے انگریز گاہکوں کو اردو میں لکھ کر پرچی دیتے تھے۔

پروفیسر امریت سنگھ پٹیالہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ ان کا خصوصی مضمون تعلیم تھا۔ انہوں نے اپنے وائس چانسلری کے زمانے کے دلچسپ واقعات Asking you Trouble میں لکھے ہیں۔ دہلی میں وہ پنجاب انسٹی ٹیوٹ کے روحِ رواں تھے۔ پنجاب کی تاریخ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ سیکولر ذہن رکھتے تھے اور ہندوستان و پاکستان کے درمیان دوستی کے زبردست حامی تھے۔

1996ء میں انہوں نے پنجاب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے 50 سال پورے ہونے پر تقسیم ہند پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا۔ اس میں مجھے بھی دعوت دی۔ ہندوستان سے اعلیٰ پائے کے مورخ اس سیمینار میں آئے۔ بعد میں ان مقالاجات پر مشتمل ایک کتاب انہوں نے مرتب کرکے شائع کی۔

پروفیسر امریت سنگھ بڑے روایتی انسان تھے۔ ادب آداب اور تعلقات کا بڑا خیال کرتے تھے۔ میں جب بھی ہندوستان جاتا انہیں فون کرتا، وہ فوراً ملنے کے لئے آجاتے۔ آخر عمر تک خود گاڑی چلاتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی، میری تحریروں کے بارے میں پوچھتے، اس پر فکرمند رہتے تھے کہ میں بیروزگار رہوں، مشورے دیا کرتے تھے، نصیحتیں کرتے تھے، نہ صرف مجھ سے اتنا لگاؤ تھا بلکہ میری فیملی کے ساتھ بھی اتنا ہی انس تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ

میں بار بار ہندوستان آتا رہوں۔

2010ء میں ان سے آخری ملاقات پنجابی انسٹی ٹیوٹ میں ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن ذہنی طور پر پوری طرح سے چست تھے، بیمار رہنے لگے تھے۔ کہنے لگے کہ آخر ایک دن جانا تو سبھی کو ہے۔ لہٰذا اس میں کیا پریشانی، میرے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھے، ہم نے مل کر کافی پی۔ انہوں نے پاکستان کے حالات پوچھے۔ دیر تک افسوس کرتے رہے کہ دونوں ملکوں میں اتنی دوری کیوں ہے؟ انہوں نے اپنا پورا کتب خانہ انسٹی ٹیوٹ کو دیدیا تھا۔ سردار مہندر سنگھ جو اس کے ڈائریکٹر ہیں، ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے، اور کوشش کرتے تھے کہ انسٹی ٹیوٹ میں لیکچرز ہوتے رہیں۔ پاکستان سے اگر کوئی سکھ تاریخ پر کام کرتا تو انہیں بے انتہا خوشی ہوتی تھی۔ میں نے پرویز اور ساجدہ وندل کی کتاب ''بھائی رام سنگھ'' پر انہیں دی تو انہوں نے فوراً اس پر اخبار میں تبصرہ کیا اور دونوں کو امرتسر اور دہلی بلوا کر ان کے لیکچرز کرائے۔

ان کی وفات کی خبر ای میل پر آئی۔ میں نے سوچا کہ ایک اور ہمدرد اور شفقت کرنے والا گزر گیا۔ اب اگر ہندوستان جانا ہوا تو ان کی غیر حاضری محسوس ہوگی۔

پروفیسر ستیش سبروال، جے۔ این۔ یو میں پڑھاتے تھے۔ مگر نہ جانے کیا دل میں آیا کہ پروفیسری چھوڑ دی، اور تھوڑی بہت رقم تھی، اسے کہیں انویسٹ کر دیا، اور فیصلہ کیا کہ بقایا وقت تحقیق میں گزاریں گے۔ لاہور میں وہ بلال احمد کے مہمان تھے، انہوں نے یہاں لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ نیشنل کالج آف آرٹس میں ایک لیکچر دیا۔ ان کے ذہن میں یہ سوال بار بار آتا تھا کہ آخر ہندوستان کیوں تقسیم ہوا؟ ہندوؤں اور مسلمانوں میں آخر کیا جھگڑے تھے کہ ایک علیحدہ ملک حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ جب کہ تقسیم کسی بھی صورت میں سماجی اور معاشی مسائل کا حل نہیں تھی؟ مجھے یاد آیا کہ نہرو نے تقسیم کے سلسلہ میں کہا تھا کہ کیسے تقسیم کرو گے۔ جب کہ ہندو اور مسلمان محلوں میں گاؤں میں اور شہروں میں مل کر رہتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہر محلّہ، گاؤں اور شہر سے مذہب کی بنیاد پر لوگوں کو علیحدہ کر دے۔ ستیش سبروال تقسیم کے مسئلہ پر ایسے الجھے کہ انہوں نے نہ صرف اسلامی تاریخ، بلکہ وسط ایشیا اور ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ وہ بنیادی طور پر ماہر عمرانیات تھے، لہٰذا انہوں نے سوشیولوجی کے نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کیا اور پانچ سال کی محنت کے بعد تقسیم ہند پر ان کی کتاب شائع ہوئی، جس میں انہوں نے اس سوال کا جواب دینے کی

کوشش کی ہے کہ آخر یہ تقسیم کیوں ہوئی؟ اس کا مسودہ انہوں نے مجھے بھیجا۔ مجھے ان کی کتاب پسند آئی، جب یہ شائع ہوئی تو میں حیران ہوا کہ کتاب کا انتساب میرے اور بلال کے نام تھا۔

تقسیم ہند پر برسوں کافی مورخوں نے کام کیا ہے۔ لیکن سبروال کا کام ان سے مختلف ہے۔ سنجیدہ تحقیق کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس پر پوری طرح سے بحث نہیں ہوئی، اور اکثر دانشوروں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کی ایک اہم وجہ تو یہ ہے کہ سبروال کا تعلق چونکہ کسی نظریاتی گروہ سے نہیں تھا۔ میں جب بھی ہندوستان جاتا سبروال سے ملاقات ہوتی۔ ان سے ای میل سے بھی رابطہ تھا۔ اکثر موضوعات پر بحث ومباحثہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ جو بھی میری دلچسپی کی کتاب ہندوستان میں چھپتی تھی، اسے خرید کر بھیج دیتے تھے۔

ان کی زندگی بڑی ڈسپلن تھی۔ اکیڈمک معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور مشورے بھی دیتے تھے۔ لاہور میں ندیم عمر سے بھی ان کا رابطہ تھا اور ان کی تحقیق میں وہ مدد کرتے تھے۔

میرا کچھ عرصہ ہندوستان جانا نہیں ہوا۔ سنا کہ بیمار ہو گئے ہیں، شاید حالت زیادہ خراب ہوگئی۔ دوستوں سے ملنا بند کر دیا۔ دلیل یہ دی کہ میری حالت ایسی نہیں کہ میں لوگوں کے سامنے آؤں۔ ایک دن ان کے لڑکے کی ای میل سے پتہ چلا کہ اس بیماری سے جاں بر نہیں ہو سکے اور انتقال کر گئے۔ ان کی وفات سے میں ایک اچھے دوست سے محروم ہو گیا، اور جب ہندوستان جانا ہوا تو مجھے دہلی خالی اور افسردہ نظر آئی۔

پروفیسر ہربنس کھیا سے پہلی ملاقات پروفیسر احسن رضا خاں نے کرائی تھی، اس کے بعد سے ہربنس بھائی سے جو دوستی ہوئی تو وہ آج تک باقی ہے۔ جب بھی ہندوستان جانا ہو، تو ان سے ملے بغیر میرا جانا لاحاصل ہوتا ہے۔ وہ مغل تاریخ کے ماہر ہیں، اور ان کی حالیہ کتاب مغلو آف انڈیا ہے، جو انہوں نے تیرہ برس کی تحقیق کے بعد لکھی۔ ان سے مل کر اور بات چیت کر کے ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھتا ہوں۔ جب وہ جے۔ این۔ یو میں شعبہ تاریخ کے پروفیسر تھے تو انہوں نے مجھے یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر آنے کی دعوت دی، مگر اس کا معاوضہ اس قدر کم تھا کہ اس میں میرا گزارا ممکن نہیں تھا، ورنہ وہاں کے ماحول میں یقیناً سیکھنے کو تھا۔ جب وہ ریٹائر ہوئے تو اعلان کر دیا کہ اب انہوں نے سنیاس لے لیا ہے اور تمام سرگرمیوں سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ مگر لوگوں نے انہیں سنیاس میں رہنے نہیں دیا اور انہیں لیکچرز کے لئے بلاتے رہے۔

آجکل وہ عہد وسطی کی تاریخ Medieval History۔ ایک ششماہی جرنل ایڈٹ کرتے ہیں جو بین الاقوامی طور پر مشہور ہے۔

خیالات ونظریات کے اعتبار سے وہ قطعی انتہا پسند نہیں ہیں، ایک زمانہ میں مارکسسٹ تھے اور کے۔ ایم۔ اشرف جو عہد وسطی کے مشہور مورخ گزرے ہیں انہیں اپنا گرو مانتے ہیں، اب وقت کے رجحانات کے ساتھ ان کے خیالات میں تبدیلی آئی ہے۔ مگر وہ ترقی پسند ہیں اور ہندوستان میں ہندو انتہا پسندی کے سخت خلاف ہیں۔ ہندوستان میں ان کی بڑی عزت ہے۔

پروفیسر امتیاز احمد بھی جے۔ این۔ یو میں سوشیولوجی کے پروفیسر تھے جب عبدالمعبود نے ان سے ملاقات کرائی ہے تو اس وقت یونیورسٹی نے انہیں ملازمت سے وقتی طور پر علیحدہ کر رکھا تھا، یعنی Suspand کر رکھا تھا۔ پس منظر یہ تھا کہ ان کے شعبہ کے سربراہ ان کی اکیڈمک کامیابیوں سے خوفزدہ ہوئے اور مختلف بہانوں سے ان پر تدریس میں غفلت کے چارج لگا کر انہیں سسپنڈ کر دیا۔ وہ تقریباً 13 سال اس حالت میں رہے، رہتے تھے یونیورسٹی کے مکان میں، چونکہ اکیلے تھے، اس لئے اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا اور ان کے ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، ہماری دوسری ملاقات نرملا دیش پانڈے یا دیدی نے کرائی، اور ایک سیمینار میں انہوں نے مجھے ان کا مہمان بنا دیا۔ اس دن سے لے کر جب بھی ہندوستان گیا، ان کا مہمان رہا۔ ملاقاتیوں کے علاوہ ان کے پاس فون آنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا، میرا خیال ہے کہ دن میں 60 کے قریب تو فون آتے ہوں گے۔ لہٰذا وہ اس قدر مصروف ہوئے کہ یونیورسٹی سے علیحدگی سے ان کو ایک طرح کی آزادی مل گئی۔ وہ یونیورسٹی سے مقدمہ بھی لڑتے رہے اور بالآخر جیتے، اور یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا۔

ان کے دوستوں میں ہندوستان کے تمام دانشور شامل ہیں، جو ان سے ملنے کے لئے برابر آتے رہتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد، وہ قریب ہی ایک بستی میں اپنا مکان بنا کر شفٹ ہو گئے ہیں۔ جہاں وہ اپنی بیگم صبیحہ کے ساتھ، اسی طرح کی مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔

دوسرے دوستوں میں خالد اشرف ہیں، جو کروڑی مل کالج میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ان سے برابر رابطہ رہتا ہے۔ جب دہلی میں ہوں تو یہ فوراً آ جاتے ہیں۔ اگر موقع مل جائے تو اپنے کالج میں لیکچر بھی کرا دیتے ہیں۔ تحقیق میں مصروف رہتے ہیں اور اب تک ادب پر کئی کتابیں لکھ

چکے ہیں۔ ان کے دوست خالد علوی بھی اردو کے پروفیسر ہیں، اور پرانے دلّی کالج میں پڑھاتے ہیں، جس کا نیا نام اب ذاکر حسین کالج ہے۔

انیل سیٹھی ایک نوجوان مورّخ ہیں، پہلے دلّی کالج میں پڑھاتے تھے اس کے بعد این۔سی۔آر۔ٹی، جو نصابی کتب کا ادارہ ہے اس میں چلے گئے، جس کے ڈائریکٹر کرشن کمار تھے۔ انہوں نے مل کر ہندوستان میں نصابی کتب کو نئے سرے سے لکھا اور اس میں سے نفرت وتعصب کو نکال دیا۔ یہ نصاب کی یہ نئی کتابیں بہت تحقیق کر کے لکھی گئی ہیں۔ خاص طور سے تاریخ کی کتابیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی ان کتابوں کو بطور ماڈل استعمال کر کے ایسی ہی نصابی کتب تیار کرانی چاہئیں جو طالب علموں کو آ گہی اور علم دیں۔

کئی سال ہوئے، میرے پاس فون آیا، کہنے لگے میں گیان پانڈے بول رہا ہوں۔ آپ کا نمبر اشیش نندی نے دیا ہے۔ میں نے پوچھا کیا آپ ہسٹورین گیان ہیں۔ کہنے لگے کہ ہاں۔ میں نے کہا میں 5 بجے آپ کے پاس آتا ہوں۔ وہ ہوٹل فلیٹی میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ان کی بیگم روبی لال بھی تھیں کہ جنہوں نے آکسفورڈ سے مغل تاریخ میں پی۔ایچ۔ڈی کی تھی۔ ملاقات بڑی دلچسپ رہی۔ ایک یا دو دن بعد ان کی بہن اور ان کے شوہر سدھیر چندر بھی آ گئے۔ پہلے ان لوگوں نے لاہور دیکھا، اس کے بعد ان کا پروگرام پشاور کا تھا۔ روبی لال کو شوق ہوا کہ وہ درۂ خیبر بھی دیکھیں۔ عام حالات میں تو شاید کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، مگر جب سے افغانستان سے جنگ چھڑی ہوئی ہے اور طالبان و القاعدہ کی وہاں موجودگی ہے۔ یہ علاقہ غیر ملکیوں کے لئے خطرناک ہے۔ پشاور یونیورسٹی میں تاریخ کے ایک نوجوان لیکچرر تھے، جن کا تعلق آفریدی قبیلہ سے تھا، انہوں نے کہا، کوئی بات نہیں، میں آپ کو لے کر جاتا ہوں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جانے سے پہلے یہ لوگ پشاور میوزیم میں گئے تھے چونکہ ہندوستان سے آئے تھے اس لئے ایجنسی کے لوگ ان کے آگے پیچھے تھے۔ آفریدی صاحب نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ کل ہم لوگ درۂ خیبر جا رہے ہیں۔ دوسرے دن جب یہ چلے تو راستہ میں کسی نے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔ بڑے آرام سے یہ چاروں مہمان اور آفریدی صاحب خیبر پہنچے اور اس تاریخی درہ کو دیکھ کر واپس ہوئے۔ لیکن پہلی ہی چیک پوسٹ پر ان کو روک لیا گیا، اور کار سے اتار کر انہیں آفس لے گئے۔ یہاں ایجنسیوں کے لوگ موجود تھے۔

لہٰذا اب پوچھ گچھ شروع ہوئی۔

اگر چہ گیان اور روبی لال پڑھا تو امریکہ میں رہے تھے، مگر تھے تو ہندوستانی۔ سدھیر اور ان کی بیگم تو پورے ہی ہندوستانی تھے۔ لیکن ان لوگوں نے شرافت کا ثبوت دیا اور چاروں کو تو ایک مکان میں شفٹ کر دیا، مگر آفریدی صاحب کو حوالات میں بند کر دیا۔ سدھیر نے داڑھی رکھ رکھی ہے، وہ تو ان لوگوں میں صوفی صاحب ہو گئے۔ اب انکوائری شروع ہوئی اس عرصہ میں مجھے کچھ علم نہ تھا کہ کیا ہوا تھا۔ میں فکرمند تھا کہ ان لوگوں نے کوئی فون وغیرہ بھی نہیں کیا۔ جب پشاور یونیورسٹی میں اس کا علم ہوا تو وائس چانسلر اور دوسرے لوگوں نے اعلیٰ حکام سے رابطے کئے، اور بالآخر چار دن کے بعد یہ لوگ چھوٹے۔

ان کی اذیت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ پشاور یونیورسٹی کے اساتذہ نے کہا کہ وہ ان کی شاندار دعوت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر چہ روبی لال کو دوسرے دن واپس ہندوستان جانا تھا، مگر ان کے اصرار پر یہ رک گئے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ فکر نہ کریں، پشاور اور لاہور کے درمیان دن رات بسیں چلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا جب رات کو 11 بجے یہ دعوت اور تقریروں سے فارغ ہو کر بس اڈے پر پہنچے تو پتہ چلا کہ آخری بس جانے والی ہے۔ یہ عام بس تھی جو ہر اسٹاپ پر رکتی ہوئی آتی ہے۔ اس میں بھی دونوں کو آخری سیٹ پر جگہ ملی، دسمبر کی سخت سردی میں دونوں ٹھٹھرتے ہوئے رات بھر کے سفر کے بعد لاہور پہنچے۔

خاص بات یہ ہوئی کہ یونیورسٹی میں دعوت کے بعد جب الوداعی ملاقاتیں ہوئیں تو آفریدی صاحب نے بڑے اعتماد اور محبت سے کہا۔ اگلی بار آپ لوگ آئے تو میں آپ کو سوات ضرور لے کر جاؤں گا۔ سوات اس لئے کہ روبی لال کا خاندان یہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان گیا تھا۔ ان کی دعوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد وہ پاکستان نہیں آئے۔ مگر جاتے ہوئے ان کے ساتھ یہ تلخ یادیں ہی نہیں تھیں، بلکہ پٹھانوں کی مہمان نوازی کے جذبات بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پشاور میں ایک دکان پر گئے جہاں ہار، زیورات اور ڈیکوریشن کی چیزیں تھیں۔ وہاں انہیں کوئی ایک چیز پسند آئی مگر قیمت زیادہ تھی، اس لئے خریدا نہیں۔ دکان سے نکل کر وہ کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ دکان کا ملازم لڑکا بھاگا ہوا آیا۔ وہ ان کی پسندیدہ چیز دیتے ہوئے کہنے لگا کہ یہ دکان کے مالک نے آپ کو بطور تحفہ دی ہے۔ جب انسانی محبت کے یہ جذبات

سامنے آئیں تو آنکھیں ضرور بھر آتی ہیں۔ لہٰذا وہ اچھی اور بری دونوں قسم کی یادیں لے کر گئے۔

اب بھی جب ان سے ملاقات ہوتی ہے وہ پاکستان کو یاد کرتے ہیں، گیان نے تقسیم ہند پر ایک بہت عمدہ تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ مجھے بتایا کہ اس کو لکھتے وقت ان کی خواہش تھی کہ پاکستان آئیں اور یہاں کے لوگوں سے انٹرویو لیں جو تقسیم کے وقت ہجرت کر کے آئے۔ مگر ان کو ویزا نہیں ملا۔ اس لئے ان کی کتاب اس لحاظ سے ادھوری ہے۔

رومیلا تھاپر ہندوستان کی مشہور ترقی پسند مورخ ہیں جو ہندو انتہا پسندوں کے خلاف برسرپیکار ہیں، انہوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ کو بالکل نئے انداز میں لکھا ہے۔ میری ان سے پہلی ملاقات تو اس وقت ہوئی جب وہ لاہور میں فیض احمد فیض فاؤنڈیشن کی جانب سے لیکچر دینے لاہور آئیں تھیں۔ میں اس وقت گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور کا ڈائریکٹر تھا۔ انسٹی ٹیوٹ میں لاہور کے دانشوروں کے ساتھ ان کی میٹنگ رکھی۔ اس کے بعد بھی ہسٹاریکل واقعات اور نصابی کتب پر ایک سیمینار کرایا تھا، وہاں ان سے دوبارہ ملنا ہوا، اس کے بعد ان سے ملنا ہوتا رہا۔ شاید 2008ء میں وہ پاکستان آئیں، اس بار وہ کٹاس کے مندر دیکھنا چاہتی تھیں۔ میں نے آنے سے پہلے انہیں لنچ کی دعوت دی، لہٰذا وہ ائیر پورٹ سے سیدھی میرے گھر آئیں۔ اس وقت ان کی سومناتھ پر کتاب چھپی تھی، جس میں انہوں نے مندر کے بارے میں اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ محمود غزنوی کے حملے کے بعد لوگ اس واقع کو بھول گئے تھے، اور مندر کے احاطے میں ایک مسجد بھی تعمیر ہو گئی تھی، اس واقعہ کو دوبارہ برطانوی حکومت نے زندہ کیا اور پھر ہندو انتہا پسندوں نے اس کو ایک علامت بنا کر ہندو مسلم تعلقات میں نفرت پیدا کی۔ ہم نے اس کتاب کا اردو ترجمہ پروفیسر ریاض صدیقی سے کرایا، جسے فکشن ہاؤس لاہور نے چھاپا۔ لہٰذا جب وہ آئیں تو میں نے کہا کہ ہم نے آپ سے پوچھے بغیر یہ ترجمہ چھاپ دیا ہے۔ وہ خوش ہوئیں پھر کھانے کے دوران اور اس کے بعد ان سے پاکستان میں تاریخ نویسی پر کافی دیر تک بات چیت رہی۔

ان سے ہندوستان میں ملنا کم ہی ہوتا ہے، کیونکہ وہ لیکچرز کے سلسلہ میں دہلی اور ہندوستان سے باہر رہتی ہیں۔

مورخوں میں کے۔ این۔ پانیکر سے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں ملاقات رہی۔ یہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں اور تاریخ میں جو ہندو انتہا پسندوں کی جانب سے دخل اندازی کی گئی

ہے اس کے خلاف ہیں۔

پروفیسر بپن چندرا سے پہلی ملاقات تو گوئٹے کے سیمینار میں ہوئی تھی جو کراچی میں ہوا تھا، اس کے بعد سے ان سے ملنا ہوتا ہے۔ وہ لاہور کے ایف۔سی۔کالج میں پڑھے ہوئے ہیں۔لہٰذا ایک بار اپنے پرانے کالج کو دیکھنے آئے، رضی عاقل، عہد وسطیٰ کے پروفیسر ہیں اور آجکل دہلی یونیورسٹی میں ہیں۔ سوچیتنا چٹوپادھیا کلکتہ کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی مگر ای میل پر ان سے رابطہ رہتا ہے۔ انہوں نے حال ہی میں کمیونسٹ پارٹی کے راہنما مظفر احمد سے بہت عمدہ کتاب لکھی ہے اس میں بیسویں صدی کے عہد کا کلکتہ، اس کی سماجی اور سیاسی زندگی کی بڑے خوبصورت انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔

پروفیسر عرفان حبیب سے پہلی ملاقات تو 1992ء میں ہوئی تھی دوسری بار 2002ء میں جب ہندوستان جانا ہوا تو ہمارے ایک دوست ادریس صاحب جو علی گڑھ کے رہنے والے تھے اور علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھے تھے وہ مجھے عرفان صاحب سے ملانے علی گڑھ لے گئے۔ عرفان صاحب سے شعبہء تاریخ میں ملاقات ہوئی۔ جہاں ان کے ساتھ پروفیسر شیریں موسوی بھی تھیں۔ اس وقت عرفان صاحب Peoples History of India کے منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے اس وقت تک چھپی ہوئی تین کتابیں مجھے دیں اور کہا کہ اگر ان کو پاکستان میں چھاپ دیا جائے تو وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ میں نے ان کی یہ کتابیں فکشن ہاؤس لاہور سے شائع کرادیں۔ عرفان صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی تحقیق کے کاموں میں مصروف ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان کے مورخوں کی ایک خواہش تھی کہ وہ مل کر ایسی نصابی کتابیں لکھیں کہ جن میں نفرت وتعصب نہ ہو۔ صحیح تاریخی واقعات کے ذریعہ نوجوانوں میں تاریخی شعور پیدا کیا جائے۔ ہمارے دوست عیسیٰ داؤد پوتہ نے تجویز دی کہ انٹرنیٹ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے اور دونوں ملکوں کے مورخ ان تاریخی موضوعات پر لکھیں کہ جو غلط فہمیاں پیدا کئے ہوئے ہیں، اس مشورے کی بڑی پذیرائی ہوئی، ہندوستان کے مشہور اخبار ہندو نے اس خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ بی۔بی۔سی انگریزی نیوز نے میرا انٹرویو لیا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان میں مورخوں کی کمی نہیں تھی، مگر پاکستان میں یہ بہت کم تھے۔ کچھ ابتدائی کوشش ہوئی، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد ایکشن ایڈ، جو ایک این۔جی۔او ہے اس کی جانب سے یہ تجویز آئی۔ اس

سلسلہ میں ایک میٹنگ دہلی میں ہوئی، اس میں ہندوستان کی جانب سے رومیلا تھاپر، کے۔این۔ پانیکر اور کرشن کمار تھے۔ پاکستان سے میں اکیلا تھا۔ منصوبے بنائے گئے، موضوعات کا انتخاب ہوا، مگر یہ بھی آگے نہیں چل سکا۔

دیدی کی بڑی خواہش تھی کہ میں اور ہربنس بھائی مل کر ایک تاریخ لکھیں۔ اس موضوع پر کئی مرتبہ بات ہوئی، مگر یہ سلسلہ بھی نہ چل سکا۔ دراصل نصابی کتابیں لکھنے کا خیال ہی صحیح نہیں تھا۔ کیونکہ ہر ریاست نصابی کتابوں کے سلسلہ میں بڑی حساس ہوتی ہے، وہ ان کتابوں کے ذریعہ اپنے نظریات کا پرچار کرتی ہے۔ اس لئے یہ نصابی کتابیں اگر لکھ بھی لی جاتیں تو یہ تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل نہیں ہونا تھیں۔ اس کے برعکس ایسی تاریخ لکھنا ممکن ہے کہ جس میں دونوں ملکوں کے درمیان جو تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے، اس کو دور کر کے، اسے صحیح تناظر میں پیش کیا جائے لیکن ہندوستان میں مورخوں کی ایک بڑی تعداد ہے جب کہ پاکستان میں اس کی کمی ہے اس لئے یہ تاریخ توازن کے ساتھ لکھنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا یہ منصوبہ خواہشات کے باوجود پورا نہیں ہوسکا۔

ہندوستان میں عبدالمعبود وہ شخصیت ہے کہ جو ہمیشہ ہندوستان پہنچتے ہی میرا چارج لے لیتے ہیں۔ میری پہلی ملاقات ہوئی ہے تو اس وقت یہ جے۔این۔یو میں طالب علم تھے، اب یہ فیملی والے ہو چکے ہیں، اور ایک پیاری بیٹی کے باپ ہیں۔ میں جانے سے پہلے انہیں فون کرتا کہ عبدالمعبود فلاں تاریخ کو آنا ہے، ٹھہرنے کا بندوبست کر دو۔ یہ جے۔این۔یو کے ہاسٹل یا کسی گیسٹ ہاؤس میں انتظام کر دیتے تھے۔ ائیر پورٹ پر لینے آتے، اور جب تک دہلی میں ٹھہرنا ہوتا، اس کا پروگرام بناتے۔ دیدی کے بڑے قریب تھے، وہ ان کی بڑی عزت کرتی تھیں، ان کے تعلقات سیاستدانوں سے لے کر ہندوستان کے تمام دانشوروں اور سماجی کارکنوں سے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے اور عطیہ کو شاعر اور فلمی ڈائریکٹر گلزار سے ملایا تھا، انہوں نے اپنی شاعری کی کتاب اپنے دستخط کے ساتھ دی تھی۔

جب ہم آخری بار ہندوستان گئے تو امرتسر سے دہلی جانا تھا۔ انہوں نے انتظام کر دیا کہ سرحد پر ایک صاحب ہیں جنہوں نے ہمارے ٹکٹ خرید رکھے تھے اور ہمیں واہگہ سے ریلوے اسٹیشن پہنچا دیا۔ وہ ہمارے لئے گھر والوں کی طرح ہیں، بڑے صاف گو، اور محبت کرنے والے ہیں۔

ہندوستان و پاکستان کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ رہتا ہے۔1990ء کی دہائی میں جب پیوپلز ٹو پیوپلز ڈائیلاگ کا سلسلہ شروع ہوا تو لوگوں کا آنا جانا ہونے لگا۔ دونوں جانب سے طلباء، دانشور اور لوگوں کی مختلف جماعتیں آنے جانے لگیں۔ ایسا محسوس ہوا کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ لیکن پھر اچانک دہشت گردی کے واقعات ہوئے اور تعلقات میں خرابی آتی چلی گئی۔

دونوں ملکوں کے تعلقات اس وقت بڑے خوشگوار ہو گئے کہ جب ہندوستانی وزیر اعظم واجپائی نے پاکستان کا دورہ کیا، اور یہ اعلان کیا کہ لوگوں کو سرحد تک ویزا دیا جائے گا۔ یہ تجاویز بھی تھیں کہ طالب علموں کو ایک دوسرے کے تعلیمی اداروں میں داخلہ دیا جائے۔ لیکن یہ صورت حال اس وقت بدل گئی کہ جب کارگل کا واقعہ پیش آیا۔ اس جنگ نے دونوں کو پھر ایک دوسرے سے دور کر دیا۔

سب سے زیادہ تعلقات میں خرابی بمبئی کے واقعہ کے بعد سے ہوئی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایک عام آدمی کے لئے ہندوستان جانا، اور ہندوستان سے پاکستان آنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ کیونکہ دونوں حکومتیں رشتہ داروں کی تصدیق کے علاوہ وہاں سے کسی گزیڈٹ آفیسر کی تصدیق چاہتے ہیں۔ لہٰذا اب دونوں حکومتوں کے اعلیٰ افسران اور وزراء تو آ جا سکتے ہیں، مگر عام آدمی کے لئے اب ویزا کا ملنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ اگر کسی کو کانفرنس میں جانا ہوتا ہے تو جب تک دونوں ملکوں کی ایجنسیاں کلیرنس نہ دیں ویزا نہیں ملتا ہے۔

جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں دہشت گرد اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ان کا مشن ہے کہ دونوں ملک اس قدر دور ہو جائیں کہ دونوں میں سیاسی، سماجی اور معاشی تعلقات نہیں رہیں۔

ان تعلقات کی خرابی کی وجہ سے وہ خاندان متاثر ہوئے ہیں کہ جن کے رشتہ دار دونوں ملکوں میں ہیں۔ اگرچہ اب نئی نسل ایک دوسرے سے ناواقف ہو رہی ہے اور کچھ عرصہ بعد یہ ایک دوسرے سے اجنبی ہو جائیں گے۔ مگر جب تک رشتہ داری باقی ہے ملنے کی خواہش تو رہتی ہے۔ اب یہ خواہش بھی آفیشل پابندیوں کی وجہ سے دم توڑ رہی ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ جب سے میرا ہندوستان جانا ہوا، کتنے دوست ہیں کہ جن سے مل کر خوشی

ہوتی ہے۔ شمس الاسلام، جو اسٹریٹ تھیٹر گروپ کے سربراہ ہیں اور اب تو دہلی یونیورسٹی کے ایک کالج کے سربراہ ہیں، ہندو انتہا پسندوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ میں شکلا، مصرا، اور شبیہ احمد بڑی محبت سے ملتے ہیں۔ بمبئی میں اصغر علی انجینئر ہیں کہ جو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں اسلام کے ترقی پسند نقطہء نظر کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت دوست ہیں، جو محبت کے ساتھ ملتے ہیں۔

اگرچہ میں گیارہ برس کی عمر میں پاکستان چلا آیا، مگر اب بھی میری یادداشت میں ٹونک کا شہر بار بار ابھرتا ہے۔ جب میں تنہائی میں ہوتا ہوں اور آنکھیں بند کرتا ہوں تو اچانک خود کو ٹونک کی گلیوں میں پاتا ہوں، اپنے گھر کا نقشہ ذہن میں موجود ہے، لوہاروں والی گلی سے گزرنا، اور سردیوں میں گڑ خریدنے جانے کے لئے حکیم صاحب کی دکان کے قریب لگے ٹھیلوں سے جا کر خریدنا۔

لیکن اب اس شہر میں میرا کوئی رشتہ دار نہیں، دنیا بدل گئی ہے، مجھے یاد ہے کہ پاکستان آتے وقت میں والد کے ساتھ اپنے دادا کی قبر پر گیا تھا جو ایک درخت کے نیچے تھی۔ میں نے بھی والد کے ساتھ فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے، اور افسردہ دل کے ساتھ واپس ہوئے۔ اب یہ یادیں باقی رہ گئیں ہیں۔ جو یاد کرو تو غمزدہ کر دیتی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ یہ دنیا کس قدر عجیب ہے، یادیں باقی رہ جاتی ہیں، جب کہ کردار ختم ہو جاتے ہیں۔

امریکہ کی دنیا

ایک رمانہ تھا کہ پاکستانیوں کے لئے یورپ اور امریکہ جانا بہت آسان تھا اگرچہ امریکہ اور برطانیہ کے لئے ویزے کی شرط تھی، مگر یہ آسانی سے حاصل ہو جاتے تھے، باقی یورپ میں کسی ویزا کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جب برطانیہ سے جرمنی گیا ہوں، یہ 1972ء کی بات ہے تو بغیر ویزے کے جانا ہوا، اور پھر بطور طالب علم یہ ویزا ہر سال حاصل کرتا رہا، اس دوران جب برطانیہ جانا ہوتا تو ویزا سرحد پر مل جایا کرتا تھا۔ یہ حالات 1976ء میں بدلے کہ جب پاکستانیوں کے لئے یورپ کے تمام ممالک نے ویزے کی شرط عائد کر دی۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستانیوں کے لئے تقریباً ہر ملک نے ویزے کی پابندی لگا دی ہے، نیپال اور سری لنکا میں یہ ائیر پورٹ پر مل جاتا ہے اور یہ ان کی مہربانی ہے۔ یورپ کے ممالک نے اس کے لئے سخت شرائط عائد کر دی ہیں، ویزے کے لئے جائیداد ہونے کی شرط ہے۔ ان کے نزدیک صاحب جائیداد کا تعلق ملک سے ہوتا ہے، ورنہ خطرہ ہوتا ہے کہ جائیداد سے محروم لوگ کسی بھی ملک میں پناہ لے سکتے ہیں۔ جائیداد کے علاوہ بینک بیلنس، انشورنس، اور دوسری شرائط ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب یورپ، کینیڈا، آسٹریلیا، اور امریکہ کا ویزا ان کو ملتا ہے کہ جن کے پاس جائیدادیں ہوں، بنکوں میں بے تحاشہ دولت ہو، اور یہ سب کچھ کرپٹ اور بدعنوان افراد کے پاس ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو ویزا ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے۔ یہ ان ملکوں میں جا کر جائیدادیں خریدتے ہیں، بنکوں میں اپنی دولت رکھتے ہیں، ان کے بچے وہیں تعلیم حاصل کرتے ہیں، یہ اپنا علاج بھی ان ملکوں میں کراتے ہیں، اور مرتے بھی وہیں ہیں، دفن ہونے کے لئے واپس اپنے ملک میں لائے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا، برطانیہ کے میگزین اکونومسٹ میں شائع ہوا تھا کہ برطانیہ کا متوسط طبقہ مہنگائی کی وجہ سے اس قابل نہیں رہا کہ وہ اپنا اپارٹمنٹ خرید سکے۔ اب یہ مہنگے

اپارٹمنٹس تیسری دنیا کے بدعنوان حکمران اوران سے منسلک لوگ خرید رہے ہیں۔اس لئے عربوں کے بعد اب اس کرپٹ طبقہ کا وجود یورپ میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ یہ مال و دولت اپنے ملکوں سے لوٹ مار کر کے حاصل کرتے ہیں، پھراس کوان ملکوں میں محفوظ کر کے اپنی کئی نسلوں تک کا انتظام کر دیتے ہیں۔ یورپ کے ملکوں کوان سب باتوں کا علم ہے مگران کے پاس یہ دولت آ رہی ہے اس لئے وہ ان کوخوش آمدید کہتے ہیں، جب کہ بہت سے افراد، جن میں طالب علم اور دوسرے لوگ ہیں،انہیں ویزا دینے سے انکار کردیا جاتا ہے۔

میں امریکہ تین مرتبہ گیا ہوں۔ایک 1982ء میں،اس بار میرے ساتھ میری بیٹی عطیہ بھی تھی، میرا برادر اِن لاء اوراس کی فیملی کیلی فورنیا میں رہتی تھی،اس کے ہاں جانا ہوا۔اس لئے ہم سان فرانسسکو کے ائیر پورٹ پراترے،ائیر پورٹ پرامیگریشن کے بعد جب کسٹم کی باری آئی،تو کسٹم افسر ہمارا سامان لے کرایک کمرہ میں چلا گیااور یہاں اس کی تلاشی لی۔اس کا مطلب تھا کہ پاکستانیوں کے بارے میں رائے بدل چکی تھی اورڈرگ کی اسمگلنگ ہونے لگی تھی، میرے ساتھ اس قسم کا یہ پہلا واقعہ تھا، بہرحال اس کے بعد باہر آئے، جہاں میرا برادر اِن لاء اوراس کی فیملی انتظار میں تھے۔ یہ لوگ لاس الٹوس (Los Altos) میں رہتے تھے، جوشہر سے باہر کا علاقہ تھا۔ اگرچہ جگہ بڑی خوبصورت اور درختوں سے گھری ہوئی تھی،مگر یہاں نہ تو کوئی پبلک ٹرانسپورٹ تھی اور نہ شہر کی چہل پہل۔میں اب تک برطانیہ اور جرمنی میں رہا تھا، یہاں بہترین ٹرانسپورٹ کا نظام ہے اپنی کار کی ضرورت نہیں ہے۔آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاسکتے ہیں۔ یہاں بغیر کار کے کہیں جا ہی نہیں سکتے تھے۔اس لئے باہر جانے کے لئے کسی کا محتاج ہونا پڑتا تھا۔ایک بس چلتی تھی جس کا اسٹینڈ کافی فاصلہ پر تھا۔مگر میں خالی گھر میں بیٹھ کر کیا کرتا، یہ فاصلہ طے کر کے آتا اور بس میں بیٹھ کرقریب کے شہر سان ہوزے (San Hose) میں چلا جاتا۔امریکہ میں اشرافیہ تو شہر سے باہر بڑے مکانوں میں رہتی ہے، جب کہ شہر میں غریب لوگ آباد ہیں۔سان ہوزے اچھا شہر ہے، میں بازار میں گھوم رہا تھا کہ ایک پرانی کتابوں کی دوکان دیکھی وہاں اس قدر کتابیں تھیں کہ میں حیران رہ گیا۔ یہاں ہر موضوع پر سکنڈ ہینڈ کتابیں تھیں۔کئی روز تک میرا یہ معمول رہا کہ میں بس میں بیٹھ کر یہاں آجاتا اور شہر میں گھومتا رہتا تھا۔مگرایک وقت آیا کہ میں اس تفریح سے تنگ آ گیا۔

ایک دن میں بس میں بیٹھ کر اس کے آخری اسٹاپ تک گیا۔ یہ اسٹین فورڈ یونیورسٹی کا

اسٹاپ تھا۔ لہٰذا میں یونیورسٹی چلا گیا۔ یہ امریکہ کی مشہور یونیورسٹی ہے۔ اس قدر وسیع وعریض علاقہ میں ہے کہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ شعبہء تاریخ کی عمارت پرانے رومی طرز کی ہے۔ طالب علم سائیکلوں پر آ رہے تھے، ہر طرف خاموشی تھی، اس یونیورسٹی کے قیام کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دن دو ادھیڑ عمر کے میاں بیوی ہارورڈ یونیورسٹی میں اس کے صدر سے ملاقات کرنے گئے۔ یہ دونوں عام لباس پہنے ہوئے تھے، اس لئے آفس میں ان پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ انہوں نے یونیورسٹی کے صدر سے ملاقات کی خواہش کی، تو اس کے سکریٹری نے کہا کہ اس کے پاس ملاقات کا وقت نہیں ہے۔ جب انہوں نے اصرار کیا تو سکریٹری نے صدر سے کہا کہ وہ ملاقات پر اصرار کر رہے ہیں، ان کو تھوڑا وقت دیدیں۔

صدر سے ملاقات پر مرد نے کہا کہ ان کا لڑکا ہارورڈ میں پڑھتا تھا۔ اس کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا، ان کی خواہش ہے کہ وہ اپنے لڑکے کی یاد میں، یونیورسٹی میں کوئی یادگار تعمیر کرانا چاہتے ہیں۔

اس پر صدر نے کہا کہ یونیورسٹی کوئی قبرستان نہیں ہے کہ جہاں اس قسم کی یادگاریں تعمیر ہوں۔

اس پر مرد نے کہا، اچھا تو ہم کوئی عمارت اس کی یاد میں بنانا چاہتے ہیں، صدر نے ان کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ”عمارت کی تعمیر میں کئی ملین ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔“

یہ سن کر بیوی اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی کہ ڈارلنگ، اگر ایسا ہی ہے تو کیوں نہ ہم اپنی یونیورسٹی قائم کر لیں۔

انہوں نے یہ اسٹین فورڈ یونیورسٹی قائم کی۔ یہ میاں بیوی کپاس کے تاجر تھے اور کروڑ پتی تھے۔

امریکہ میں وہاں کے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں نے نہ صرف یونیورسٹیاں قائم کیں، بلکہ جگہ جگہ کتب خانے، میوزیم، اور کلچرل سینٹرز بھی بنوائے۔ یہ لوگ بیرن بینڈٹ (Baren Bandits) یعنی ڈاکوؤں کے سردار کہلاتے تھے، مگر انہوں نے مذہبی عمارتوں اور یادگاروں پر اتنا خرچ نہیں کیا، جتنا تعلیمی اداروں اور سیکولر عمارتوں اور اداروں پر۔ اس وقت امریکہ میں تھنک ٹینکس (Think Tanks) کے نام سے تقریباً تمام ادارے صنعت کاروں کے فنڈ سے چل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار ادارے ہیں کہ جو اساتذہ اور طالب علموں کو تحقیق کے لئے وظیفے دیتے ہیں۔ ادب اور علمی کتابوں پر انعامات دیتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے سماج میں لبرل، روشن خیال اور سیکولر سوچ کے فروغ میں بڑی مدد دی ہے۔

ایک دن میں برکلے یونیورسٹی کے کیمپس کو بھی دیکھنے گیا۔ اسٹین فورڈ یونیورسٹی اپنے قدامت پسند نقطہ نظر کی وجہ سے مشہور ہے، جب کہ برکلے ریڈیکل خیالات کا مرکز ہے۔ امریکہ کی یونیورسٹیاں اس لحاظ سے علمی مرکز ہیں، چونکہ ان کے پاس فنڈز کی کمی نہیں اس لئے انہوں نے یورپ کے بہترین پروفیسروں کو اپنے ہاں بلالیا ہے۔ اپنے سرمایہ دارانہ نظریات کے باوجود اس کی یونیورسٹیوں میں ہر قسم کے خیالات ونظریات رکھنے والے پروفیسر اور طالب علم ہیں۔ مارکس ازم پر بھی یہاں کام ہوتا ہے اور پڑھایا جاتا ہے۔ نازی حکومت کے زمانے میں فرینکفرٹ اسکول کے اسکالرز امریکہ چلے آئے تھے، اور یہاں وہ یونیورسٹیوں میں پڑھاتے رہے۔ پروفیسر مارکوزے ہی کے خیالات نے 1960ء کی دہائی میں طالب علموں کی تحریک پیدا کی۔ اب بھی یہاں پروفیسر ہیبر ماس (Habermas) پڑھانے آتے ہیں۔ ارک ہابس بام جو کہ مارکسسٹ مورخ تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے وہ بھی یہاں پڑھانے آتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں نظریات کی آزادی ہے اور وہ امریکی سرمایہ دار اب بائیں بازو کے نظریات سے خوف زدہ نہیں ہیں، بلکہ ان سے سیکھ رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نئے افکار اور خیالات کی تخلیق بائیں بازو کے دانشور ہی کرتے ہیں۔ کیلی فورنیا کی ریاست میں ابتدائی دور میں آنے والے سکھ حضرات تھے، اس زمانہ میں یہاں نسلی تعصبات بہت زیادہ تھے، اس لئے انہیں تجارت یا زراعت کے لئے نہ تو بنکوں سے قرضہ ملتا تھا، اور نہ ہی گوری لڑکیاں ان سے شادی کرتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے میکسیکو عورتوں سے شادیاں کیں، ان کی اولاد اس طرح سے تین شناختوں کی حامل ہے، امریکی، میکسیکو اور ہندوستانی۔ نام بھی ان کے ملے جلے تھے جیسے ہوزا سنگھ۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی سینٹ ڈیوس میں میری دوست کیرن لیونارڈ، انتھراپولوجی کی پروفیسر ہیں، انہوں نے پنجابی شناختیں (Punjabi Identity) کے نام سے ان لوگوں پر ایک کتاب لکھی ہے۔

ان حالات کی وجہ سے کیلی فورنیا کی سکھ کمیونٹی سیاسی طور پر بے انتہا باشعور ہو گئی تھی۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے غدر پارٹی بنائی تھی، جس کا ہیڈ کوارٹر سان فرانسسکو میں تھا۔ یہ اردو اور ہندی میں اخبار بھی نکالتے تھے۔ ہندوستان آنے پر ان میں کئی پر غداری کا مقدمہ چلا اور پھانسی دی گئی۔ اب یہ کمیونٹی تو پکی امریکن ہو گئی ہے، مگر اپنے مذہب اور لباس کی

شناخت کو انہوں نے اب بھی قائم رکھ رکھا ہے۔

امریکیوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے پاس تاریخی عمارتیں اور یادگاریں نہیں ہیں۔ ان کی اپنی تاریخ 500 سال کی ہے۔ اس عرصہ کی عمارتوں کو ہی انہوں نے تاریخی بنا دیا ہے، اس کے علاوہ جو بھی عجیب وغریب عمارت اور مکان ہے وہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ ہم ایک مکان دیکھنے گئے کہ جس کی مالکن نفسیاتی مریض تھی، اسے خوف تھا کہ کوئی اسے مار ڈالے گا، اس لئے اس نے مکان کو بھول بھلیوں کی شکل میں تعمیر کرایا۔ اب یہاں سیاح آتے ہیں، مکان کو دیکھنے کا ٹکٹ ہے، باہر اس کے پوسٹ کارڈ فروخت ہوتے ہیں، یہ ایک تفریح کی جگہ ہوگئی ہے۔

اسی طرح کیلی فورنیا میں ایک جگہ اونچی پہاڑی پر لوہے کی ایک بڑی سلاخ ہے جو ایک تار سے بندھی ایک جگہ فکس ہوگئی ہے۔ یہ جگہ شاید کسی گراویٹی (Gravity) یا کسی مقناطیسی کشش کی وجہ سے ایک جگہ ٹھہر گئی ہے یہاں بھی اسے دیکھنے کے لئے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔

سان فرانسسکو شہر بڑا خوبصورت ہے۔ ایک کلچرل شہر ہے۔ جگہ جگہ نوجوان گانا گاتے اور رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کا چائنا ٹاؤن بھی مشہور ہے۔ میں کوئی ڈھائی مہینہ رہا، کیلی فورنیا کے علاوہ اور کوئی اسٹیٹ نہیں دیکھی۔ واپسی پر برطانیہ میں ایک ہفتہ قیام کرتے ہوئے واپس پاکستان آگیا۔ دوسری مرتبہ 2005ء میں جانا ہوا۔ اس وقت میری بڑی بیٹی شکاگو یونیورسٹی میں تھی، اور شہلا نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ ایم کر کے نیویارک بار کا امتحان پاس کر کے نیویارک میں پریکٹس کر رہی تھی۔ وہ کوئنز کے علاقے میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ اس علاقہ میں اکثریت یونان سے آنے والے لوگوں کی تھی، ان کے ریسٹورنٹ اور دوکانیں تھیں۔ قریب میں دریا تھا جس کے کنارے لوگ کرسیاں بچھائے بیٹھے رہتے تھے اور زور زور سے میوزک سن رہے ہوتے تھے۔ قریب میں باغ تھا، جہاں لوگ جاگنگ کرتے اور چہل قدمی کرتے نظر آتے تھے۔

شہلا نے پہلے تو نیویارک گھمایا، ایرانی، لبنانی اور یونانی ہوٹلوں میں کھانا کھلایا۔ اس کے بعد میٹروپولیٹن میوزیم لے گئی، اس میں اس قدر نوادرات ہیں کہ دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایک دن میں تو صرف ایک یا دو ہال دیکھے جاسکتے ہیں، نیویارک کاسموپولیٹن شہر ہے۔ یہاں سب وے میں ٹرین میں بیٹھو تو انگریزی کے علاوہ یونانی، ہسپانوی، اطالوی، پرتگیزی، اردو اور

ہندی سننے کوملتی ہے چونکہ یہاں ہرنسل اورقوم کے لوگ آباد ہیں۔اس لئے نسلی تعصب نہیں ہے
نیویارک کومزیداس وقت اوردیکھا جب عطیہ بھی شکاگو سے آ گئی۔

لیکن پہلے میں اس سے ملنے شکاگو گیا۔اس وقت وہ ایک عجیب وغریب مکان میں دوسرے طالب علموں کے ساتھ رہ رہی تھی، یہ مکان یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا تھا جوانہوں نے طالب علموں کی رہائش کے لئے دیدیا تھا۔اس کا کرایہ بہت کم تھا۔مگر یہاں رہنے والوں کوسخت ڈسپلن کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہر طالب علم کو باری باری کچن اور باتھ رومز صاف کرنا ہوتے تھے،جن کا معائنہ ایک ٹیم کرتی تھی کہ صفائی اچھی ہوئی ہے یااس میں خرابی رہ گئی ہے۔اس طرح مکان کی مرمت اوردیکھ بھال کے لئے ہرطالب علم کو ہفتہ یامہینہ میں کچھ گھنٹے دینے ہوتے تھے۔

یہاں امریکی طالب علموں کے ساتھ عرب،اور ہندوستانی طلبہ بھی تھے۔ان کے ساتھ اچھی گفتگورہتی تھی۔شکاگو یونیورسٹی راک فیلر نے قائم کی تھی، یہ کافی وسیع علاقہ میں ہے،نئی عمارتیں بھی ہیں،اور پرانی بھی۔لائبریری بہت عمدہ ہے خصوصیت سے اس کا اردو کا حصہ ہندوستان اور پاکستان میں چھپنے والی کتابوں سے بھرا ہوا ہے،میری بھی سولہ کتابیں یہاں ہیں،شکاگو میں اردو کے پروفیسر سی۔ایم۔نعیم صاحب اگرچہ ریٹائر ہو گئے ہیں،مگراب پروفیسر امیریٹس (Emritus) ہیں،ان سے ملاقاتیں رہیں،پروفیسر مظفرعالم جے۔این۔یو سے یہاں آ گئے ہیں ان سے بھی ملنا ہوتا تھا۔

شکاگو لیبر تحریک کی وجہ سے بڑا مشہور ہے۔یہیں پر پولیس کی فائرنگ سے مزدور راہنما شہید ہوئے تھے،جن کی یاد میں یکم مئی کو لیبر ڈے منایا جاتا ہےاس وقت امریکہ میں انارکسزم کی تحریک زوال پر تھی۔ انارکسٹ ہرقسم کی سیاسی، سماجی اور مذہبی اتھارٹیز کے خلاف تھے۔ اس تحریک کی مشہور لیڈر ایما گولڈمن (Eama Goldman) تھی کہ جس کا خاندان روس سے ہجرت کر کے امریکہ آیا تھا۔ایما نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے،اس کا ایک حصہ بڑا دلدوز ہے،بچپن میں اس کا باپ اس سے نفرت کرتا تھا کہ وہ لڑکی ہے،اس کولڑکے کی خواہش تھی اس لئے وہ ہر بات پراسے مارتا تھا۔ایک جگہ وہ لکھتی ہے کہ اس کا باپ ایک خوبصورت مرد تھا،وہ اس سے محبت کرتی تھی،اوراس کی خواہش تھی کہ وہ اسے پیار کرے اور گلے لگائے۔مگراس کے باپ نے کبھی اس سے پیار نہیں کیا، ایک وقت وہ آیا کہ اسے اپنے باپ سے نفرت ہو گئی۔ ایک دن وہ انارکسٹوں کے ایک جلسہ میں چلی گئی، وہاں اس نے جوتقاریر سنیں تو وہ ان سے متاثر ہوئی، اور

اس تحریک میں شامل ہوگئی۔ جلد ہی وہ ایک شعلہ بیاں مقرر بن گئی، جو عورتوں کے حقوق اور مزدوروں کی جدوجہد میں پوری طرح سے شامل تھی۔ امریکہ کی حکومت اس کی سیاسی سرگرمیوں سے اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ اسے امریکہ سے جلاوطن کر کے روس بھیج دیا۔

روس میں 1917ء کا انقلاب آچکا تھا، مگر وہ کمیونسٹ پارٹی کے جبر اور ریاست کی پابندیوں کو برداشت نہیں کر سکی اور یورپ آ گئی، یہاں بھی اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، آخر میں کینیڈا چلی گئی، مرتے وقت اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس کو ہے مارکٹ کے مزدور شہیدوں کے ساتھ قبرستان میں دفن کیا جائے، اس کی قبر اب وہیں ہے۔

میں سوچتا ہوں کیا لوگ تھے اپنے نظریہ کی خاطر اور عوام کی خاطر ان لوگوں نے کیا کچھ نہ سہا، کیا کیا قربانیاں نہ دیں، آج دنیا کی ترقی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اگرچہ لوگوں کی اکثریت ان کے ناموں اور کاموں سے واقف نہیں، مگر انہوں نے ایک مقصد کی خاطر اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ ہمارے سیاستدانوں اور دانشوروں کو ان کی اس تاریخ کو پڑھنا چاہئے، اور اس سے سبق بھی سیکھنا چاہئے۔

شکاگو سے میں عطیہ کے ساتھ نیویارک آ گیا، اب ہم تینوں نے مل کر نیویارک کی سیر کی، ان شہروں میں خاص بات یہ ہے کہ یہاں ہر قوم کے لوگ آئے ہوئے ہیں اس لئے ان کی ہوٹلیں اور ریسٹورنٹ ہیں، لبنانی، ویت نامی، انڈونیشیائی، مصری، تیونس اور ہندوستان و پاکستان کے ہوٹل۔

ایک دن میں اور عطیہ اس چھوٹے سے جزیرے میں گئے کہ جہاں لبرٹی کا مجسمہ ہے، اس کے ساتھ والے جزیرے میں ان لوگوں کا میوزیم ہے کہ جو ہجرت کر کے آئے تھے اور پہلے اس جزیرے میں اترے تھے، بعد میں امریکہ کے دوسرے شہروں میں گئے، وہاں ابتدائی دور کے ان مہاجروں کی تصاویر بھی ہیں، اور ان کے بارے میں لکھا ہوا مواد بھی ہے، ہمیں اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ ان مہاجرین میں ہندوستان سے آنے والوں میں سب سے پہلے سکھ تھے۔

ایک مہاجر خاتون کے دلچسپ ریمارکس تھے کہ ہم نے سنا تھا کہ امریکہ میں سونے کے فٹ پاتھ ہیں، جب ہم یہاں آئے تو پتہ چلا کہ یہاں تو کوئی فٹ پاتھ سرے سے نہیں ہیں، اس لئے انہیں اب تعمیر کرنے کا کام ہمارا ہے۔

لبرٹی کا یہ مجسمہ فرانس نے امریکہ کی آزادی پر ان کو تحفہ دیا تھا۔ مگر یہ اندر سے کھوکھلا ہے۔ پتہ نہیں اس میں کوئی طنز ہے، یا ایسا اسے ہلکا رکھنے کو کیا گیا ہے۔

گرمیوں میں نیویارک شہر میں بڑی کلچرل سرگرمیاں ہوتی ہیں۔اس کے لنکن سینٹر میں موزارٹ اور بیتھوون کی میوزک کا کنسرٹ تھا، بڑا لطف آیا۔ براڈوے کے تھیٹر میں Fiddle on the roof دیکھا۔اس کی فلم بھی بن چکی ہے، میوزیکل فلم اور تھیٹر ہے۔ نیویارک ہی میں متبادل تھیٹر ہالز بھی ہیں، جن میں ریڈیکل ڈرامے ہوتے ہیں۔ایک ہال میں ''پارسیاں'' (The Parsian) یونانی ڈرامہ کو عراق کی جنگ کے مناظر میں پیش کیا گیا، ہال میں تقریباً 60 یا 70 لوگ تھے، جو غور و فکر کرنے والے دانشور تھے۔ نیویارک یونیورسٹی کے اردگرد ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہیں، جہاں طالب علم گھنٹوں بیٹھے بحث و مباحثہ بھی کرتے ہیں اور اپنا کام بھی کرتے ہیں، ایک کافی کا کپ پیا اور وقت وہیں پر گزار دیا۔

یہاں کتابوں کی جو بڑی دوکانیں ہیں، وہاں کافی کارنر بھی ہے، اور چھوٹا سا ہال ہے کہ جہاں کتابوں کے اجراء کے فنکشن ہوتے ہیں، شہر میں چھوٹے میوزموں کی بھی بڑی تعداد ہے کہ جہاں نوجوان آرٹسٹوں کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی پینٹنگز کی نمائش کر سکیں۔

موماں کی آرٹ گیلری میں بہترین آرٹسٹوں کی پینٹنگز ہیں۔اس کے علاوہ خاص خاص آرٹسٹوں کے فن پاروں کی نمائش بھی ہوتی رہتی ہے۔اس کے سینٹرل پارک میں بھی شیکسپیئر اور دوسرے ڈرامہ نگاروں کے ڈرامے ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ فری ہوتے ہیں، مگر ان کا ٹکٹ لینے کے لئے صبح سے لائن میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔

ایک دن میں اور عطیہ کولمبیا یونیورسٹی دیکھنے چلے گئے۔اس کے ساتھ ہی ہارلم کا علاقہ ہے جہاں کالوں کی اکثریت رہتی ہے، اور جس کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑا خطرناک ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ علاقہ بڑا پس ماندہ ہے، نیویارک شہر کی بلند و بالا عمارتوں اور چہل پہل کے مقابلہ میں یہ تیسری دنیا کا علاقہ معلوم ہوتا ہے۔

کالوں کے بارے میں اس قسم کی باتیں مشہور ہیں کہ یہ بدمعاش، چور، اچکے ہیں ایسا نہیں ہے، ان کی اکثریت اگرچہ غریب ہے، مگر محنت کرنے والے، اور پُرامن لوگ ہیں۔ان کے ساتھ جو کچھ صدیوں سے ہوا، ان کی محرومیوں کو دیکھا جائے، تو مجرم امریکہ کے گورے باشندے ہیں، ہمارے دوست نعمان نقوی جو کولمبیا یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، ایک دفعہ بتایا کہ ایک دن وہ یونیورسٹی سے باہر سگریٹ پی رہے تھے کہ ایک کالا نوجوان آیا اور ان سے ایک سگریٹ کی فرمائش کی جو انہوں نے اسے دیدیا، اس پر نوجوان نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں، انہوں نے کہا پاکستان کا،

نوجوان نے کہا، اسے اس کا تو پتہ نہیں کہ پاکستان کہاں ہے مگر وہ یقیناً امریکہ سے اچھا ہوگا!

کالوں کے سلسلہ میں میں یہ ذکر کرتا چلوں کہ جب ہم بالٹی مور گئے تو وہاں کالوں کا میوزیم دیکھنے گئے، جو ایک نجی میوزیم ہے، اور انہوں نے چندہ اکٹھا کر کے بنایا ہے۔ اس میں پوری تفصیل ہے کہ انہیں افریقہ سے جہاز میں زنجیروں میں باندھ کر لایا جاتا تھا، پھر منڈیوں میں فروخت کیا جاتا تھا۔ وہ کھیتوں اور کانوں میں محنت ومشقت کرتے تھے، اور گورے ذرا ذرا سی بات پر انہیں قانون کی پرواہ کئے بغیر قتل کرتے تھے۔ ایک جج تھے کہ جن کا نام لنچ (Lynch) تھا انہوں نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ غلام کو عدالت میں لانے کی ضرورت نہیں، عوام خود فیصلہ کر کے سزا دیدیں، اس سے Lynching کا لفظ نکلا ہے کہ جس میں لوگ ان کالوں کو سرے عام پھانسی دیتے تھے یا مار مار کر ختم کر دیتے تھے۔ ان کی نسلیں اس دکھ، درد اور تکلیف سے گزری ہیں، اب بھی قانون میں حقوق کے باوجود ان کی اکثریت غربت ومفلسی کی زندگی گزار رہی ہے۔ یہ اپنے دکھ کا اظہار اپنے گانوں کے ذریعہ بڑے دلدوز انداز میں کرتے ہیں۔

نیویارک میں ریڈ انڈینز کا بھی ایک میوزیم ہے، جہاں ان کی دست کاری کے نمونے ہیں اور ان کا لٹریچر ہے کہ کس طرح سے یورپی باشندوں نے ان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان کی زمینوں پر قبضہ کیا۔ اینڈریو جیکسن، جو امریکہ کے صدر ہوئے ان کی شہرت یہی تھی کہ انہوں نے ریڈ انڈینز کا قتل عام کیا تھا، ان کا کہنا تھا کہ (good Indian is a dead Indian) یعنی ایک مرا ہوا انڈین ہی سب سے اچھا ہوتا ہے۔ یورپی لوگوں نے مقامی باشندوں کی زمینوں پر، انہیں بے دخل کر کے قبضے کئے، اور ان کو پیچھے کی جانب دھکیلتے رہے۔ اینڈریو جیکسن کی صدارت کے دوران جورجیا کی ریاست نے مقامی باشندوں کی آبادی کو خالی کرنے کا حکم دیا تاکہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جائے۔ اس پر یہ مقامی باشندے امریکہ کے سپریم کورٹ میں گئے، وہاں فیصلہ ان کے حق میں ہوا، مگر جورجیا کی ریاست نے اس فیصلہ کی پرواہ نہیں کی اور ان کو زبردستی بے دخل کیا، یہ لوگ یہاں سے چل کر دوسری جگہ آباد ہوتے گئے تو راستے میں جن دکھوں اور تکلیفوں سے گزرے، اس کی وجہ سے یہ آنسوؤں کا راستہ یا Trail of tears کہلاتا ہے۔ جیکسن نے بھی اس سلسلہ میں کوئی ایکشن نہیں لیا۔ اب یہ مقامی باشندے امریکہ کے شہروں میں کہیں نظر نہیں آتے ہیں، انہیں کیمپوں میں محصور کر کے رکھ

دیا ہے، ہٹلر ان کیمپوں سے اور یورپی سفید فام کے ان اقدامات سے بڑا متاثر تھا، اس نے Concentration Camps کا آئیڈیا یہیں سے لیا تھا، جہاں یہودیوں، خانہ بدوشوں اور کمیونسٹوں کا قتل عام کیا گیا۔

امریکہ کا یہ دوسرا دورہ اس طرح سے ختم ہوا کہ نیویارک سے ہم لوگ فلاڈلفیا گئے کہ جہاں آزادی کے بعد، آزادی کا اعلامیہ شائع کیا گیا تھا۔ یہاں کا میوزیم بہت اچھا ہے اس میں چند فارسی کے مخطوطات بھی ہیں۔ امریکیوں کو جو بھی نادر چیز مل جائے اسے خرید کر اپنے ہاں لے آتے ہیں، تاکہ ان کے ذریعہ وہ پرانی دنیا سے اپنا رشتہ قائم رکھیں۔

بالٹی مور میں عجب اتفاق ہے کہ یہاں لیاقت میڈیکل کالج کے پڑھے ہوئے 15 یا 20 ڈاکٹرز ہیں، یہاں ہم ڈاکٹر سلیم کے مہمان تھے، گیان پانڈے اور ان کی بیگم روبی لال، یہاں جان ہوپکنس یونیورسٹی میں تھے، مگر وہ انہیں دنوں یہاں سے دوسری یونیورسٹی جا رہے تھے، لیکن ان سے ملاقات ہوگئی۔ یہاں سے ایک دن کے لئے واشنگٹن گئے، اور پھر واپس نیویارک، اور وہاں سے پاکستان کو واپسی، اس طرح میرا امریکہ کا دوسرا دورہ مکمل ہوگیا۔

تیسری بار میں امریکہ مارچ 2012ء میں گیا، اس وقت مقصد اپنی آنکھوں کے سلسلہ میں جانا ہوا تھا، اس وجہ سے زیادہ وقت نیویارک میں گزرا اور وہاں بھی شہر دیکھنے کو کم نکلنا ہوا۔

نیوجرسی میں ہمارے دوست ظفر خضر رہتے ہیں، لہٰذا یہ ہوتا تھا کہ ہر ویک اینڈ پر ان کے پاس نیوجرسی چلے جاتے تھے، وہ شہر کے باہر رہتے تھے، اور حال ہی میں انہوں نے ایک محل نما مکان خریدا ہے۔ انہیں پاکستان کے حالات درست کرنے کی فکر رہتی ہے، اس لئے زیادہ وقت ان کے ساتھ سیاسی موضوعات پر بات چیت میں گزرتا تھا۔ مارچ ہی کے مہینہ میں یہاں عمران خان کی پارٹی کا ایک جلسہ قریبی شہر کی ہوٹل میں تھا۔ ظفر خضر نے ہمارے لئے بھی کھانے کی ٹیبل بک کرائی تھی ہم اس جلسہ میں شریک ہونے گئے، امریکہ میں رہتے ہوئے بھی، پاکستانیوں کے نظم و ضبط کا وہی حال ہے جو یہاں ہے۔ جلسہ ایک گھنٹہ کی تاخیر سے شروع ہوا، انتہائی فرسودہ اور بیکار تقریریں ہوئیں، فنڈ کے لئے اپیل کی گئی، جس پر لوگوں نے کوئی زیادہ توجہ نہیں دی۔ دوسرے دن ظفر خضر نے اپنے گھر پر تقریباً چالیس لوگوں کو بلا رکھا تھا، اگرچہ پاکستان کے لئے لوگوں کے دلوں میں ہمدردی ہے، مگر نظریات وہی فرسودہ، یہ سب دیکھ کر افسوس ہوا۔

جب میں 2005ء میں آیا تھا، اس وقت میری ملاقات نور سالک صاحب سے ہوئی تھی، اوران کے گھر کھانا بھی کھایا تھا۔ اس بار ظفر خضر کے ہاں دوبارہ ملاقات ہوئی، ان کے ساتھ امتیاز صاحب بھی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ چند دوستوں نے مل کر یہاں تھنکرز فورم یو۔ ایس۔ اے بنا رکھی ہے جس کے تحت اکثر لیکچرز اور مباحثہ کراتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے لیکچر کی دعوت دی، وہاں میں نے دانشور اور معاشرہ پر ایک لیکچر دیا۔ مگر ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم پاکستانی 1947ء میں آ کر ٹھہر گئے ہیں۔ سوالات ہوئے تو وہی اقبال اور جناح، تقسیم ہند وغیرہ۔ میں نے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں ان سب سے گریز کر کے آگے بڑھنا چاہئے۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے اور دنیا کہیں کی کہیں پہنچ گئی ہے۔ اقبال اور جناح اب اس دنیا کے نہیں، کسی اور دنیا کے ہیں، انہیں وہیں رہنے دیں۔ لیکن یہ باتیں لوگوں کو سمجھ آتی نہیں ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں پاکستانیوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ رہتے تو ہیں، ایک سیکولر اور ترقی شدہ معاشرے میں، مگر ان کی سوچ اپنی سوسائٹی میں ٹھہر کر رہ گئی ہے۔ اگرچہ پاکستان میں بھی اب تبدیلیاں آ رہی ہیں، مگر یہ لوگ جس وقت ملک چھوڑ کر گئے تھے اب تک اسی زمانہ میں ٹھہر کر رہ گئے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ لوگ پاکستان سے مولویوں، گانے والوں، یا شاعروں کو بلاتے ہیں ___ اس کا مقصد سیکھنا نہیں بلکہ تفریح ہوتا ہے۔ یہ کسی سنجیدہ دانشور کو نہیں بلاتے کہ جو انہیں پاکستان میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے اثرات سے آگاہ کرے۔ اس لئے اگرچہ ان کے دلوں میں ملک کے لئے نیک جذبات ہیں، مگر ان نیک جذبات کو فرسودہ اور بیکار خیالات و افکار کے ذریعہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔

اس طرح میرا تیسرا سفر بھی ختم ہوا۔

o

تلخ نوائی

انسان کو زندگی میں تجربات ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان تجربات سے سیکھتا ہے بشرطیکہ تجربات ایک جیسے ہوں، اگر وہ نت نئے ہوں، تو انسان ان تجربات کو جمع کرتا چلا جاتا ہے اور شاید سیکھتا کم ہی ہے۔ جن افراد کو ہم تجربہ کار کہتے ہیں، وہ ذہین اور باصلاحیت لوگ ہوتے ہیں جو حالات کا اندازہ لگا لیتے ہیں، مگر ہر انسان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔

پاکستان میں خصوصیت کے ساتھ، اور ممکن ہے اس کا اطلاق دوسرے معاشروں میں بھی ہو، وہ یہ کہ حالات سے سمجھوتہ کر کے زندہ رہو، کسی کو ناراض نہ کرو۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سمجھوتہ کے اصول پر عمل کیا جائے تو کیا پھر ایمانداری، دیانت، اور نظریات کو قربان کر دینا چاہئے۔ ہمارے ہاں تجربہ کار لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ ''چلو تم اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو''، خیالات و نظریات، دیانت داری، ان کی کوئی حقیقت نہیں رہتی ہے، اگر سمجھوتہ پر عمل کیا جائے۔

چنانچہ پاکستان میں سیاست دانوں، دانشوروں، صحافیوں کی قلابازیاں مشہور ہیں مگر ان قلابازیوں سے سمجھوتہ کرنے والے فکرمند نہیں ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں اس عمل کو ہوشیاری اور کامیابی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب معاشرہ کو کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو یہ اس کی بداعمالیوں اور برائیوں پر پردہ ڈالتی ہے۔ یہ لوگ ہر سطح پر قبول ہوتے ہیں ان کی تعریف وتوصیف ہوتی ہے۔

جو سمجھوتہ کے اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں، وہ ایک ایک کر کے دوستوں کی دوستی سے محروم ہوتے جاتے ہیں۔ ایک وقت وہ آتا ہے کہ معاشرے میں ان کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے۔

میں نے یہ تمہید اس لئے باندھی کہ میں جن تجربات سے گزرا ہوں ان کا ذکر کروں تاکہ

میرے اندر جو خلش ہے وہ باقی نہیں رہے۔ جن لوگوں کو مجھ سے شکایت ہے وہ اس کا یا تو اظہار کرتے ہیں یا پھر اسے خاموشی سے برداشت کرتے ہیں چونکہ میرا تعلق لکھنے پڑھنے سے ہے، اس لئے میرے تجربات دانشور دوستوں یا طالب علموں کے ساتھ ہوئے جن میں اچھے اور برے دونوں ہی شامل ہیں۔ تعلقات میں خرابی کی اصل وجہ کتابوں پر تبصرے یا سیمینار اور کانفرنس میں تنقیدی نقطۂ نظر رہا ہے۔ چونکہ میں ابتداء ہی میں جن تجربات سے گزرا، ان سے سیکھ کر پھر کوشش کی کہ تبصروں اور تنقید سے گریز کیا جائے، اس لئے اس قسم کے واقعات بہت زیادہ نہیں ہوئے۔ دوسرے جب احباب پر یہ واضح ہوا کہ کس قسم کا تبصرہ ہوسکتا ہے انہوں نے دعوت دینا چھوڑ دی۔

خورشید قائم خانی ہمارے اچھے دوست ہیں۔ ان سے دوستی اس وجہ سے ہوئی کہ وہ ایک زمانہ میں اسٹار میں ہر ہفتہ سندھ کے خانہ بدوشوں پر بڑے اچھے مضامین لکھ رہے تھے اس لئے ہم نے انہیں تلاش کیا اور بہت جلد دوستی ہوگئی۔ میں نے ان سے فرمائش کی کہ وہ ان مضامین کا اردو میں بھی ترجمہ کریں، تاکہ زیادہ لوگ انہیں پڑھیں۔ یہ کام انہوں نے بہت عمدگی سے کیا، میں نے اس کا تعارف لکھا، جو انہیں پڑھوایا، اور یہ کتاب فکشن ہاؤس لاہور سے ''بھٹکتی نسلیں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس وقت میں لاہور آچکا تھا اور گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ خورشید قائم خانی آئے ہوئے ہیں، اور مجھ سے ناراض ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا وجہ ہے؟ بہرحال کچھ دن گزرنے کے بعد ان کا فون آیا کہ معاف کرو مجھ سے غلطی ہوئی، میں نے پوچھا کہ وجہ کیا تھی؟ تو کہنے لگے کہ کتاب کا تعارف میرے خلاف تھا، میں نے کہا کہ مگر میں نے آپ کو پڑھوایا تھا، اگر اعتراض ہوتا تو اسی وقت کہہ دیتے۔ کہنے لگے، مجھے ٹنڈو الہ یار کے لڑکوں نے کہا کہ اس میں تو مجھ پر تنقید کی گئی ہے، اس لئے میں ناراض ہوگیا تھا۔ بہرحال دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے میرا تعارف نکال دیا۔ اگرچہ اس کے بعد ان سے ملنا ہوتا رہا، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ناراضگی ابھی تک باقی ہے۔ اچھے دوستوں کو کھونے کا افسوس ہوتا ہے۔

کتاب کے تعارف کے سلسلہ جاری رہے۔ ایک پاکستانی دانشور اطہر علی جو شاعر ہیں، اور لندن میں رہتے ہیں انہوں نے مغربی تہذیب کی تنقید پر ایک کتاب لکھی، مجھ سے فرمائش کی کہ اس کا تعارف لکھ دوں۔ تعارف لکھا، جب کتاب چھپ کر آئی تو اس میں میرے تعارف کی جگہ

پروفیسر منظور صاحب کا تعارف تھا۔ ہماری سندھ یونیورسٹی کے بیوروکریٹ شاہد احمد نے بنگلہ دیش پر اپنی یادداشتیں لکھیں، مجھ سے تعارف کے لئے کہا، مگر حسب معمول کتاب چھپ کر آئی تو تعارف غائب تھا۔ میر پور آزاد کشمیر کے ایک دانش ور نے تعارف لکھوایا، کتاب شائع ہوئی تو نام تو میرا تھا مگر تعارف ان کا ہی لکھا ہوا تھا، جس میں سٹالن کی تعریف اور ٹراٹسکی کی مذمت کی گئی تھی۔ اس کے بعد سے تعارف لکھتے ہوئے میں ہچکچاتا ہوں۔

جب زبیدہ مصطفیٰ، ڈان کے میگزین ''بکس اینڈ آتھرز'' کی انچارج تھیں تو وہ اکثر تبصرے کے لئے کتابیں بھیجتی رہتی تھیں۔ غیر ملکی مصنّفین کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کوئی ڈر نہ تھا کیونکہ وہ موجود نہیں ہوتے تھے۔ مگر پاکستانی مصنّفین پر تبصرہ ذرا مشکل تھا۔ مجھے دو کتابیں یاد ہیں، جن میں سے ایک پر تبصرہ کیا تھا، اور دوسری واپس منگالی گئی تھی، سہیل لاری نے سندھ کی تاریخ پر کتاب لکھی، اس پر میں نے تھوڑی سی تنقید کر دی، جس پر وہ سخت ناراض ہوئے اور ڈان کو میرے خلاف ایک خط لکھا۔ زبیدہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ خط شائع کر دیں۔ میں نے کہا، ضرور، مجھے اعتراض نہیں۔ انہوں نے جہاں تنقید کی وہاں آخر میں لکھا کہ انہیں مجھ سے بڑی ہمدردی تھی کہ سندھ یونیورسٹی نے مجھے مہاجر ہونے کی وجہ سے نکالا، مگر اب ان کی ہمدردیاں ختم ہوگئیں۔ انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ سندھ یونیورسٹی سے میں نے 27 سال کے بعد ریٹائرمنٹ لی تھی۔ نکالا نہیں گیا تھا۔

دوسرا واقعہ اس طرح ہوا کہ میرے پاس ایک خاتون آئیں کہ جن کے شوہر کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ نہ جانے انہیں کیوں خیال آیا کہ پاکستان میں لوگ مغلوں کو بھول رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے پلان بنایا کہ مغل خاندان پاکستان میں غیر مقبول ہو رہا ہے۔ وہ خود تو مورخ نہیں، مگر یہ کافی تھا کہ ان کے تعلقات بڑے لوگوں سے تھے۔ وہ مجھ سے ملنے لاہور آئیں اور کہا کہ میں بھی کوئی ایک مقالہ ان کی کتاب کے لئے لکھوں، میں نے وعدہ کر لیا۔ مگر جلد ہی ان کی اس قسم کی ای۔میلیں آئیں کہ اس میں یہ بھی شامل کر لیں، یا اس کا بھی اضافہ کر دیں، تو میں نے لکھا کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، اس میں انہیں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال میں نے اپنی پیش کش واپس لے لی۔ مغلوں پر یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی نے شائع کی۔ جس میں مختلف لوگوں کے مقالے تھے۔ ڈان نے ریویو کے لئے مجھے بھیج دی، ابھی میں نے پڑھ کر لکھنا شروع

نہیں کیا تھا کہ ڈان سے فون آیا کہ میں کتاب واپس بھیج دوں، اور اس پر ریویو نہ کروں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جب خاتون ایڈیٹر کو یہ پتہ چلا کہ کتاب مجھے بھیجی گئی ہے تو انہوں نے کہا کہ مجھ سے ریویو نہ کرایا جائے۔ لہٰذا بعد میں انہوں نے اپنی پسند کا ریویو شائع کرایا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ ڈان اخبار نے بھی میری دیانت داری پر شبہ کیا، اور سمجھا کہ میں ریویو میں بدلہ نہ لے لوں۔

کتابوں کے اجراء پر اکثر جانا ہوتا ہے اور کبھی کبھی کتاب پر مضمون بھی پڑھنا ہوتا ہے۔ دو واقعے ایسے ہوئے کہ جن میں صاحبان کتاب ناراض ہو گئے۔ 1989ء میں، ابھی میں نیا نیا لاہور آیا تھا کہ زاہد چوہدری کی کتاب، جسے جعفر زیدی نے مرتب کیا، "پاکستان کیسے بنا؟" شائع ہوئی، اس کا اجراء آواری ہوٹل لاہور میں ہوا۔ مجھ سے بھی کہا گیا کہ میں اس پر تبصرہ کروں۔ کتاب پڑھ کر میں نے تبصرہ لکھا، اور صاحب کتاب سے کہا کہ اگر میں تنقید کروں تو برا تو نہ مانو گے۔ وہ کہنے لگے قطعی نہیں۔ میری تنقید بہت معمولی تھی۔ لیکن جب جعفر زیدی آخر میں تقریر کرنے آئے تو کہنے لگے، مبارک صاحب نے کیا کیا ہے، چند پمفلٹس لکھے ہیں، ہماری طرح سے کوئی ضخیم کتاب لکھیں تو جانیں۔ اس کے بعد سے انہوں نے اپنی کسی تقریب میں نہیں بلایا۔

ہمارے دوسرے دوست جو اچھے انسان اور عالم ہیں، انہوں نے اردو ادب کی تاریخ لکھی ہے، اجراء کے موقع پر میں نے ذرا تنقید کرتے ہوئے کہہ دیا کہ کتاب میں قصباتی کلچر کو منفی طور پر پیش کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جب مغل دربار زوال پذیر ہوا اور ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں اور علماء کی سرپرستی نہیں کر سکا تو یہ لوگ اپنے آبائی قصبوں میں جا کر آباد ہو گئے اور ایک عمدہ قصباتی کلچر وجود میں آیا۔ اس کے بعد سے ان کی ناراضگی مجھ سے ختم نہیں ہوئی۔

اس لئے سوچتا ہوں کہ وہ لوگ اچھے ہیں کہ جو یہ کتاب کی تعریف کر دیتے ہیں، اور اس کو اردو ادب، یا شاعری، یا تاریخ میں اہم اضافہ قرار دیدیتے ہیں۔

کچھ دانشوروں نے میری کتابوں پر بھی تنقید کی، جو ابتداء میں تو اچھی نہیں لگی، مگر جب ٹھنڈے دل کے ساتھ اس تنقید کو پڑھا تو اس سے سیکھا اور اس وجہ سے برداشت کی عادت پیدا ہوئی۔

ایک مسئلہ جس سے میں دوچار ہوا، وہ یہ کہ ہمارے دانشور دوسروں کی تحریروں کو نقل کرتے ہیں اور یہ اعتراف نہیں کرتے کہ یہ کس کی ہیں؟ نہ ہی حوالہ دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

خاص طور سے اردو کے لکھنے والے، یا تو اس سے واقف نہیں کہ اگر کسی کی تحریر کو وہ استعمال کر رہے ہیں تو اس کا حوالہ دیں، وہ اس کو اپنا سمجھ کر اپنا لیتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے کئی بار ہوا، ایک مرتبہ گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک سابق پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب مجھے دی، میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں میرے نیشنل ازم پر مضمون کے اقتباسات پورے کے پورے نقل تھے اور کہیں حوالہ نہیں تھا۔ انہوں نے جب یہ کتاب مجھے دی تو شاید ان کے ذہن میں قطعی یہ نہیں تھا کہ انہوں نے کوئی جرم کیا ہے۔ اس کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ یہ تو شاید معصومیت کی وجہ سے ہوا، مگر کچھ ہمارے بین الاقوامی شہرت کے مورخ بھی یہ کام کرتے ہیں، ان کا خیال ہوتا ہے کہ باہر والوں کو اردو میں لکھی کتابوں کے بارے میں علم نہیں، اس لئے ان کی گرفت نہیں ہوگی۔ پتہ نہیں کیوں ہمارے دانشور دوسروں کے خیالات اور تحقیق کا اعتراف کرتے ہوئے کیوں شرمندہ ہوتے ہیں۔ تاریخ کے بارے میں جو باتیں میں نے لکھی تھیں اب اکثر انہیں دہرایا جاتا ہے مگر کوئی اعتراف نہیں کرتا کہ اس نے یہ خیالات کہاں سے لئے۔

کئی مرتبہ دلچسپ واقعات ہوئے۔ میں نے بریخت کے ایک افسانہ کا ترجمہ کیا اور جرمن میں اس کا موضوع ہے "Unwurdige Frau" یعنی عزت سے محروم عورت۔ میں نے موضوع کے لحاظ سے اس کا عنوان لکھا "دوسالہ عورت" ایک مرتبہ ایک لکھاری میرے سامنے کسی سے کہہ رہے تھے کہ انہوں نے بریخت کے افسانہ دوسالہ عورت کو ڈرامائی شکل دی ہے۔ انہوں نے کہیں یہ اعتراف نہیں کیا کہ انہوں نے میرے ترجمہ کو استعمال کیا ہے۔ اس لئے "اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔"

پاکستان کے معاشرے میں اس وقت اپنے آپ کو تسلیم نہیں کرایا جاسکتا جب تک کہ آپ کا تعلق کسی نہ کسی مافیا سے ہو۔ اگر کوئی آزاد رہنا چاہتا ہے، تو اس کے لئے اس معاشرے میں کوئی جگہ پانا مشکل ہے۔

تاثرات

چونکہ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے، اس لئے میں بچپن اور جوانی میں محرومیوں کا شکار رہا ہوں۔ لہٰذا میں نے ان محرومیوں کے ساتھ رہنا سیکھ لیا ہے۔ میری زندگی جدوجہد میں گزری، اس دوران میں نے ناکامیوں کو بھی دیکھا۔ لیکن میں مسلسل اپنے مشن میں لگا رہا۔ زندگی میں اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگ ملتے ہیں ان سے آپ کو خوشی و مسرت بھی ملتی ہے اور دکھ اور غم بھی۔ لوگ آپ کی راہ میں مشکلات بھی پیدا کرتے ہیں، اور آپ کو آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیتے ہیں۔ زندگی کی محرومیوں اور دکھوں سے بچنے کے لئے میرے پاس ایک ہی راستہ تھا، وہ کتابیں جن کے اندر میں نے پناہ لی۔ ان کتابوں نے مجھے نہ صرف حوصلہ دیا، بلکہ میرے تخیل، ارادوں اور عزائم کو پختہ کیا۔ ان کتابوں نے مجھے بڑی حد تک لوگوں سے دور کر دیا، اور تنہائی کا عادی بنا دیا۔ میں آج بھی ان کے درمیان گھرا ہوا خود کو محفوظ اور پُرسکون پاتا ہوں۔ لیکن ان کتابوں نے میری زندگی کو بدلنے میں بڑا کردار ادا کیا۔

میری پرورش روایتی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس ماحول میں نیکی بدی اور اچھے و برے کے بارے میں پختہ نظریات تھے۔ لیکن کتابوں نے میرے اندر تجسّس کو پیدا کیا اور سوالات کو ابھارا۔ شک و شبہ کے جراثیم پیدا ہوئے، اور بغاوت کی طرف طبیعت مائل ہونے لگی۔ یہ ایک بڑا آہستہ عمل تھا، یکدم نہیں، بلکہ مرحلہ وار۔ جب روایتی نظریات ٹوٹتے ہیں تو ایک اضطراب اور کش مکش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے کہ فرد اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ روایت اور جدیدیت میں مقابلہ ہوتا ہے اور یہ جنگ جاری رہتی ہے۔ کبھی یہ ڈر اور خوف ہوتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے اور کبھی یہ احساس کہ ہم کس اندھیرے میں زندہ رہ رہے ہیں، اس سے نجات پائی جائے۔

پاکستانی سوسائٹی کا المیہ یہ ہے کہ جیسے جیسے یہ سیاسی، معاشی اور سماجی طور پر غیر مستحکم ہوتا چلا گیا، اسی طرح سے اس میں قدامت پرستی کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ خاص طور سے متوسط طبقہ روایت کی زنجیروں میں خود کو اسیر کرتا رہا، دوسری جانب ریاست نے جب نظریاتی ہونے کا اعلان کر دیا، تو اس میں دوسرے نظریات کی گنجائش نہیں رہی۔ ان حالات میں انحراف کرنے والوں کے لئے ایک طرف ریاست کا جبر ہے تو دوسری جانب، بقول جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) اکثریت کی آمریت (Tyranny of Majorty) ہے۔ ان حالات میں یہ انتہائی مشکل امر ہے کہ پاکستانی سوسائٹی میں نئے خیالات و نظریات ابھر سکیں۔ اس نے سوسائٹی کو جامد اور ٹھہرا کر رکھ دیا ہے۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ فرد ریاست کے جبر سے مقابلہ کر سکتا ہے، مگر سوسائٹی کے جبر سے مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے، یہ اسے تنہا کر کے، اس کے معاشی ذرائع کو بند کر کے، اس کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

چونکہ ہماری سوسائٹی میں نظریات و خیالات پر مباحثہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم پرانے نظریات پر قائم ہیں، اپنی تمام ناکامیوں کے باوجود ذہنی طور پر تیار نہیں کہ اپنی غلطیوں کو تسلیم کریں، اور آگے کی جانب بڑھیں۔

جب قدامت پرستی کی زنجیریں مضبوطی سے لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں، جب ذہن روایات کی ہتھکڑیوں میں اسیر ہو جاتے ہیں، تو اس وقت مشکل ہوتا ہے کہ اس قید سے کیسے آزاد ہوا جائے۔ جب آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جائیں تو روشنی کی چکاچوند انہیں پریشان کر دیتی ہے اور وہ واپس اسی اندھیرے میں پناہ لیتے ہیں شاید ہماری سوسائٹی اس وقت اس مرحلے پر ہے۔

ہمارے معاشرے میں ان دانشوروں کی پذیرائی ہے کہ جو روایت پرستی اور قدامت پسندی کی نئی تعبیر اور تفسیر کر کے انہیں نئی زندگی دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ دانشور کہ جوان روایات کے خلاف ہیں، وہ معاشرے میں کسی قابلِ احترام جگہ کے مستحق نہیں ہوتے ہیں۔

میں خود کو روایات اور قدامت پرستی کے منحرفین میں شمار کرتا ہوں اس وجہ سے لوگوں کی اکثریت کو میری تحریریں پسند نہیں، مگر ایک اقلیت ایسی ضرور ہے کہ جو انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں، اکثر مجھے ایسے مداح مل جاتے ہیں کہ جو میری تحریروں سے متاثر ہو کر خیالات بدلنے

پر مجبور ہوئے۔ میں صورت حال سے مایوس نہیں ہوں، اور مطمئن ہوں کہ میں نے اس معاشرے میں ذہنی شعور کو پیدا کیا ہے۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ محض تحریر یا تقریر کے ذریعہ معاشرہ میں تبدیلی نہیں آتی ہے، جب تک کہ سیاسی جماعتیں یا گروپس ان تحریروں کی بنیاد پر تحریک نہیں چلاتیں۔ تاریخ میں یہ ضرور ہوا ہے کہ اول نظریات کی تخلیق ہوتی ہے، اور بعد میں ان کی بنیاد پر سیاسی و سماجی اور معاشی تبدیلیاں آتی ہیں۔ فرانس کے انقلاب میں، روسو کے نظریات نے اہم کردار ادا کیا اس کے نظریات کی بنیاد پر انقلابی حکومتوں نے دساتیر بنائے۔ اگر یہ نظریات نہیں ہوتے تو ان کے لئے انقلاب کی راہیں متعین کرنا مشکل ہوتا۔ یہی صورتِ حال روس اور چین کے انقلابوں میں پیش آئی جو مارکس کے نظریات سے متاثر ہوئے اور انہیں عملی جامہ پہنایا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر نظریات کو عملی شکل دینے کا مرحلہ پیش نہ آئے تو وہ ذہنوں میں رہ جاتے ہیں اور کسی ایسے وقت کا انتظار کرتے ہیں کہ جب تحریکیں انہیں اختیار کریں۔

پاکستان کو ایسے دانشوروں کی ضرورت ہے جو بدلتے ہوئے حالات میں سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلی کی نشاندہی کرتے ہوئے نئے خیالات اور افکار پیدا کریں جبکہ سیاسی جماعتیں اور ان کے رہنما ان کو عملی شکل دیں۔ ان دونوں کی جدوجہد کے نتیجے میں ملک پس ماندگی سے نکل کر ترقی کر سکے گا۔